Registered No. L. 4186

ربیع الاول ۱۳۵۹ھ | جلد ۱۶ - عدد ۳
ربیع الآخر ۱۳۵۹ھ | جلد ۱۶ - عدد ۴

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے | قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انھیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہوجاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنےوالی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جب کسی شخص پر بار بار تشنج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور درمیانی وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اسکی حالت دیکھ کر عقلمند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض اوپری خلل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کر خود اسکے اپنے نظام جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے، ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے، بخار کا علاج برف میں دبانے سے کرتے ہیں یا ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس اصل خرابی کو سمجھیں جو کارگاہ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے اور ساری تدبیریں اسی کو دور کرنے میں صرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحب عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اسکے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالم انسانی اس وقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اس پر تشنج کا ایک ایسا زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین دہل گئی ہے۔ اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اُس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں۔ اور دوروں کے درمیان جو وقفہ گذرتا ہے اس میں بھی وہ کبھی چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے کل ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدتہائے دراز سے یہ صورت حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، کسی کا ذہن ادھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدن و عمران کی اساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بوجھ بجھکڑ اپنی اپنی

نظریں صرف اُن خارجی علامات ہی پر جمائے ہوئے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں، اور ہر ایک کو سطح پر جو پھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر انگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اسکا آپریشن کردو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا - کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹرشپ ہے، اسے کاٹ دو - کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے اسے مٹادو - کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے اسکا خاتمہ کردو -

ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہوگئی ہے، یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں - ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہیں اور ہے، اور جب تک زمین پکڑے رہیگی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہینگی خواہ قیامت تک ان کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے -

---

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اسکی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا - یہی ام الخبائث ہے - یہی اصل بس کی گانٹھ ہے - اسی سے وہ شجر خبیثہ پیدا ہوتا ہے جسکی شاخیں پھیل پھیل کر انسان پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں - یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کریں، بجز اسکے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے -

ڈکٹیٹرشپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائیگا تو حاصل کیا ہوگا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائیگا اور اسکی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائیگی - مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟ امپیریلزم کا خاتمہ کیا جائیگا تو اسکا حاصل کیا ہوگا؟ بس یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اتر جائیگی - مگر کیا واقعی اسکے بعد زمین پر امن اور خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیونکہ

انسان کو چین نصیب ہے؟ جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوئی ہے؟ سرمایہ داری کا استیصال ہو جائیگا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ صرف یہ کہ محنت پیشہ عوام مال دار طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے بندے بن جائینگے۔ مگر کیا اس حقیقت میں آزادی، عدل اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟ اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نصب العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بس اس سے زیادہ نہیں ہے کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اسکے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اُس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اُس جاہل اور نادان خدا کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائیگا جسکے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جابرانہ خواہشات؟

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے سلب ہو کر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور یہ مصیبت کا حل نہیں ہے بلکہ صرف اس کا اعادہ ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلاب بلا اب تک جس راستہ سے آ رہا ہے اُدھر سے نہ آئے بلکہ دوسرے راستہ سے آئے۔ اِسکو اگر حل کہا جا سکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر لیا۔ اگر مقصود محض دق کو دور کرنا تھا تو بے شک آپ کامیاب ہوئے، لیکن اگر اصل مقصد جان بچانا تھا تو ایک پیام اجل کو دوسرے پیک اجل سے تبدیل کر کے آپنے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جائے،

بہر حال ان تمام صورتوں میں تباہی اور خسران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمہ دار اور مسئول رعیت ہے وہ اگر غیر ذمہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس ادعا کی اور ایسے ادعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہر حال وہی کی وہی رہے گی۔ حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہیگا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہیگا۔ مگر جب بندہ اس عظیم الشان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اٹھائیگا کہ وہ خود حاکم اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اس کا حاکم اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کریگا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جسکے سامنے وہ جواب دہ ہو اور اپنے امر و نہی میں جسکی رضا لینے کا محتاج ہو تو یقیناً اس کی زندگی کی عمارت از سر تا پا غلط ہو کر رہ جائیگی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی، جو اپنی ہوا، اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جس کی قدرت انسان کا اور اس پوری زمین کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس کے حیطۂ قدرت سے انسان کسی حال میں نکل ہی نہیں سکتا، عقل اور فطرت کا تقاضا ہے کہ وہی انسان کا اور اس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اس کے سوا اور کس کو حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک مملوک یہ کہنے کا حق دار ہو

سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے مملوکوں کا مالک ہے یا خود اپنا مالک ہے؟ صانع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردوں کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہوسکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے کہ اس سلطنت میں فرمانروائی کرسکے؟ اگر انسان اس مملکت کے اصلی سلطان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اسکے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے، یا خود اپنی حاکمیت کا ادعا کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے۔ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جسکی تردید زمین اور آسمان کی ہر شئے ہر وقت کر رہی ہے۔ ایسے بے بنیاد دعوے، اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقت نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہیگا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہیگا۔ البتہ خود اس انسان کی زندگی از سر تا بقدم غلط ہو کر رہ جائیگی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرکے، یا خود اپنی حاکمیت کا مدعی بن کر کام کریگا۔ حقیقت اس کی محتاج نہیں ہے کہ تم اسکا ادراک کرو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں، تم خود اسکے محتاج ہو کہ اسکی معرفت حاصل کرکے اپنی سعی و عمل کو اسکے مطابق بناؤ۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوسکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اسکو جزوی ترمیمات اور فروعی اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جاسکتا۔ ایک جھوٹ کے ہٹ جانے اور اسکی جگہ دوسرے جھوٹ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تبدیلی سے طفل تسلی تو ہوسکتی ہے مگر غیر حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔ اس نقصان کو دور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے کی کوئی دوسری

صورت اسکے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیتہً انکار کیا جائے اور اسکی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اس نظام حکومت کو رد کر دیا جائے جو انسانی اقتدار اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اس نظام حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدار اعلیٰ اُسی کا رہے جو فی الحقیقت مقتدر اعلیٰ ہے۔ ہر اس حکومت کے حق حکمرانی کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جس میں انسان بذاتِ خود حاکم اور صاحب امر و نہی ہونے کا مدعی ہو، اور صرف اُس حکومت کو جائز حکومت تسلیم کیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہوگی، جب تک انسان کی حاکمیت، خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصور کی جگہ خلافت الٰہی کا واقعی تصور نہ لے لیگا، اس وقت تک انسانی تمدن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہو سکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹر شپ کی جگہ جمہوریت متمکن ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہو سکتا ہے، اور اسی کو اختیار کر کے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی و جہد کا صحیح رُخ پا سکتا ہے۔ رب العالمین اور عالم الغیب و الشہادۃ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن و عمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانب داری، تعصب اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان و قیاس پر نہیں بلکہ حقائق فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہو سکتا ہے کہ وہ خود صاحب امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دست بردار ہو جائے، خدا پر اور اسکے بھیجے ہوئے قانونِ زندگی پر ایمان لائے اور آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھتے

ہوئے اس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا مقصود ہو، بلکہ اسے تمام نوع انسانی کی فلاح و سعادت مطلوب ہے جس کے لیے وہ ایک عالمگیر کلیہ و ضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زاویہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اسکے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث و مسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی و بنیادی مسائل کی طرف توجہ کرتا ہے جن کے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر اپنا زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے زور آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمہ پر براہ راست حملہ کرتا ہے، تاکہ ان شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ آئے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیان نازی، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں ان کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے پوچھتا ہے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ؟

”متفرق چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اس ایک اللہ کی جو سب پر قہر و تسلط رکھتا ہے“؟

جو لوگ پہلی صورت کے پسند کرنے والے ہیں اسلام ان سب کو ایک سمجھتا ہے، خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ ان کی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ اُن میں سے کسی کی دشمنی بھی نفس فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے اور اسلیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہو اور اسکی جگہ وہ فساد سربلند ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اُس کا اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اُس کے لیے تو ایک چھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے چھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اسکی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کریگا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو تمام متفرق غیر حقیقی ربوں اور الٰہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے جو فی الحقیقت رب الناس، ملک الناس اور الٰہ الناس ہے۔

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض عَلَم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطور مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریق کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریق کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالات زمانہ اور مقتضیات وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں ہے۔ مسلمان جہاں جس زمانہ اور جس ماحول میں بھی ہونگے انکو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہر حال سابقہ پیش ہی آئیگا۔ تو وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جائے، اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسب سہولت کوئی دوسرا

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول و ربیع الآخر ۵۹ھ (مطابق مئی و جون ۴۰ء) جلد ۱۶ - عدد ۳ و ۴

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ، لاہور میں طبع ہو کر

دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا۔

نظریہ اختیار کر لیا جائے۔ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا ہی مسلمان ہونا ہے۔ ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نامسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پیروی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپکا نقطۂ نظر اور طریق کار اُس مسلک کے مطابق ہو جسکے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان سچا مسلمان اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کرنے دو، بعد میں حالات جب سازگار ہو جائینگے تو مسلمان بنکر کام کرنے لگونگا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ بجائے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظام زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اسکا ذہن اسلام کے سانچہ میں پوری طرح نہیں ڈھلا ہے جسکی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسکی کیا پالیسی ہونی چاہیے۔

ایک حقیقی مسلمان کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھ اس پر مسرت ہو۔ بلکہ اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہلِ فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے اسی قدر ٹرکی اور دوسرے

ملکوں پر خود ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اسلئے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں ان کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ مغضوب علیھم کی تعریف میں آتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اہم واقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائیگی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کرینگے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہوگا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کرینگے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبداللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نراا نیشنلزم ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم" بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی قابل لعنت ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائیگی تو کیا بگڑ جائیگا؟ یہ کونسا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان حکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حکم الناس کے آگے۔ اگر حکم اللہ کے آگے جھکتا

ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بھی بیچ میں سے ہٹائیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حکم الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار، مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک رہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھونگا۔

مسلمان کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریزی کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لا اِلٰہ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے، بلکہ اس پر ہے کہ اسکے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اسلیے ہے ——— اور مجاہدین حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے؟ ——— کہ امپیریلزم کے الٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے الٰہ کو بت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا اور منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلینگی خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیان شرع مبین، دونوں قسم کے رہنما

اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں، دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں ہوائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، ورنہ یہ دیکھتے کہ اصلی شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصلی شیطان غیر اللہ حاکمیت ہے۔ اس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ لڑنا ہے تو اسکے لیے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے اس ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اسے مٹانے پر صرف کرو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کرو گے وہ اسی طرح پراگندہ اور رائیگاں ہو کر رہیں گی جس طرح اُن لوگوں کی مساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بیچاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے، مگر حیرت اور ہزار حیرت ہے ان علمائے کرام پر جن کا رات دن کا مشغلہ ہی قال اللہ و قال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے پر بھی انہیں اُس قطعی اور دوامی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کے لیے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔ جن مسائل کو انہوں نے اہم اور اقدم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم کو انکی فروعی اور ضمنی اہمیت کا بھی نشان نہیں ملتا۔ جن معاملات سے بے چین ہو کر انہوں نے دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور تڑپ تڑپ کر تقریریں کیں، اس نوعیت کے معاملات کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اس کے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی

آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ۔ خواہ بابل کی سرزمین ہو، یا ارضِ سدوم، یا ملک مدین، یا حجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو، یا بیسویں، یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو، یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو، یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بامِ عروج پر۔ ہر جگہ، ہر دور میں ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے لیڈروں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔" حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اِس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے، کَفَرۡنَا بِکُمۡ وَبَدَا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗۤ۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر اَرۡسِلۡ مَعِیَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کا مطالبہ پیش کرنے سے پہلے اِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ کا اور قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِبَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ کا دعویٰ پیش کیا اور اسے آگاہ کر دیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا، رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی۔ حضرت عیسیٰ نے جنکی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡہُ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جسکی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر لیڈر نے ہر ملک ہر زمانہ اور ہر قوم میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی بنا پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا اور وہ اسی کے

حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب یا تو یہ کہدیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ لیڈر جو خدا کی طرف سے آئے تھے، سب کے سب عملی سیاسیات سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کونسی چیز مقدم اور کونسی موخر ہونی چاہیے، اور انہیں خبر نہ تھی کہ آزادی کے لیے جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات کو حل کرنے کی کیا تدبیریں ہیں۔ یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہیں وہ جزئیات شرع پر خواہ کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہرحال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اُس تحریک سے ہے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظام فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں، اور ہمارے گردوپیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لیے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانہ میں چلتے رہے۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔ ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے انہوں نے دیکھا۔ ہمارا معیار قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی پالیسی اُنہی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرز عمل اختیار کرینگے تو گمراہ ہو جائینگے۔ یہ بات ہمارے مرتبے سے بہت فروتر ہے کہ ہم اُس تنگ زاویے سے معاملات دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک وطن پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی ان کو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے

بلند ترین منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں - اگر ہم ان کے سے ڈھنگ اختیار کرینگے، انہی کی زبان میں باتیں کرینگے، اور انہی گھٹیا درجہ کے مقاصد پر زور دینگے جن پر وہ فریفتہ ہیں تو ہم اپنی وقعت کو خود ہی خاک میں ملا دینگے - شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا۔ اب وہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اسکی وہ پوزیشن تسلیم کرینگے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت اور اقلیت کے نوحے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور روایان ریاست کے ظل عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف یہ آزادی وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں - یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط پوزیشن اختیار کرتے ہیں اور اپنی پوزیشن اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے - خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے - ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں - یہ شیر کا سا منصب ہے، اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں بلکہ صرف شیر کا سا دل درکار ہے - وہ شیر شیر نہیں ہے جو اگر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح ممیانے لگے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے۔

مقالات

امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی

(از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

[مولانا مناظر احسن صاحب کا یہ نہایت بیش قیمت اور قابل قدر مضمون رسالہ "الفرقان" بریلی سے نقل کیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں سر عنوان تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو بنایا گیا ہے مگر اس ضمن میں فاضل مقالہ نگار نے ایسا مواد جمع کر دیا ہے جو اسلام کے نظریۂ حکومت پر اور اُس ارتجاعی تحریک پر جو روح اسلامی کے خلاف پہلی صدی ہجری کے وسط میں رونما ہوئی تھی، اچھی خاصی تیز روشنی ڈالتا ہے۔

دراصل یہ تاریخ کا ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اسلام جو ایک عالمگیر اصلاحی و انقلابی تحریک کی حیثیت سے اٹھا تھا اور جس نے سیاست و اجتماع کا بالکل ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے پیش کیا تھا، اس کے پیرووں کا رخ یکایک خلافت راشدہ کے ڈھنگ پر چلتے چلتے آخر کس طرح ملوکیت اور قیصریت کی طرف پھر گیا۔ اس مسئلہ کے صحیح حل پر تاریخ اسلام کے صحیح فہم کا بہت کچھ انحصار ہے۔ مگر اس میں دو پیچیدگیاں ایسی واقع ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے مسلمان عموماً اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ جس دور میں یہ جوابی انقلاب اور تغیرِ راہ واقع ہوا اس سے مسلمانوں کی گہری عقیدتیں وابستہ ہیں، اس لیے واقعات اور اشخاص کے متعلق جچی تلی رائے قائم کرتے ہوئے مسلمان ڈرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کو اسلام اور

مسلمان میں سخت التباس پیش آیا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مسلمان کریں وہی اسلام ہے۔
وہ اس فرق کو نہیں سمجھتے کہ اسلام ایک تحریک کا نام ہے جو ایک خاص نظام فکر (Ideology)
پر مبنی تھی اور مسلمان ان قوموں اور انسانی گروہوں کا نام ہے جو اس تحریک کے زیر اثر آئے۔ اس فرق
کو پوری طرح ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے تاریخ مسلمین بعینہٖ تاریخ اسلام قرار دے لی گئی ہے اور اس طرح
تاریخ اسلام کا تصور بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ اس جوابی انقلاب سے پہلے اور اس کے
بعد کی تاریخ کو یکساں طور پر اسلامی تاریخ ہی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسی نظر سے اس کو دیکھتے
بھی ہیں، حالانکہ اسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جوابی
انقلاب سے پہلے تاریخ جس رفتار پر چل رہی تھی اس کے بعد یکایک اس کا راستہ بدل گیا اور وہ ایک
دوسرے راستہ پر پڑ گئی۔ اس مقالہ میں اگرچہ مولانا مناظر احسن صاحب نے پوری طرح اس پہلو کو
سامنے رکھ کر حالات مرتب نہیں کیے ہیں، تاہم جو مواد انہوں نے جمع کیا ہے اس میں ایک صاحب
بصیرت آدمی تاریخ کے اس تغیر کو صاف دیکھ سکتا ہے۔

اس مقالہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے ناظرین کو یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تفصیلات
سے قطع نظر، اصولی حیثیت سے پوری انسانی تاریخ دراصل دو متقابل طاقتوں کی کشمکش کی تاریخ ہے۔
ایک اسلام یعنی دین فطرت (Real nature of man) کی قوت۔ دوسری جاہلیت یعنی
مسخ شدہ فطرت انسانی (Perverted nature of man) کی قوت۔ اس کشمکش میں کبھی اسلام
ابھر آتا ہے اور جاہلیت دب جاتی ہے، اور کبھی جاہلیت ابھر آتی ہے اور اسلام دب جاتا ہے جب
اسلام کا غلبہ ہوتا ہے تو جاہلیت اس کے خلاف رجعت (Reaction) کے لیے زور لگاتی
ہے اور جب جاہلیت ابھرتی ہے تو اسلام اس کے مقابلہ میں انقلاب کے لیے زور لگاتا ہے۔ دونوں قوتوں
کے لیے انسان ہی واسطہ (Agents) کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، مگر اسلام اور جاہلیت کے

نازک اور باریک فروق کو بالکل واضح (Clear-cut) صورت میں بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان دونوں کو غلط ملط کر کے کچھ اس طرح پراگندہ خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کام تو جاہلیت کے لیے کر رہے ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام کے لیے کر رہے ہیں، یا کام اسلامی ڈھنگ اور اسلامی تخیل پر شروع کرتے ہیں اور چلتے چلتے اسلامی سرحدوں سے گزر کر جاہلیت کی حدود میں چلے جاتے ہیں۔

اس طویل تاریخی کشمکش کے دوران میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ اسلام اپنی خالص صورت میں ظاہر ہوا اور تمدن و عمران کی بنیاد بنا۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی قیادت میں اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی حکومت میں۔ مگر بعد میں پھر جاہلیت کی قوتیں زور پکڑتی رہیں اور اسلام سے جاہلی نظام زندگی کی طرف رجعت واقع ہو جاتی رہی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو حالت رونما ہوئی تھی وہ دراصل اسلام کا ایک کامل و اکمل ظہور تھا جس میں جاہلیت کو پوری طرح جڑ سے اکھاڑ کر اجتماعی اخلاق و معاملات کی بنیاد خالص اسلامی اصولوں پر رکھی گئی تھی۔ جس سوسائیٹی کو اس زبردست انقلابی طاقت نے جنم دیا تھا اس میں تمام افراد یا کم از کم انکی ایک عظیم اکثریت کی ذہنیت پوری طرح بدل گئی تھی، حتیٰ کہ زندگی کے تمام چھوٹے اور بڑے مسائل پر انکا زاویۂ نظر خالص اسلامی ہوگیا تھا۔ اسی وجہ سے سیاست و عمران کا وہ نظام قائم ہوا اور چل سکا جس کا رنگ عہد نبوی اور عہد صاحبین میں نظر آتا ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کی جماعت (Body-politic) میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی اور باہر سے بھی گھس آئی جو اپنے خیالات اور نقطۂ نظر میں جاہلیت کا ایک معتدبہ عنصر لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے جو لوگ نو مسلم تھے وہ اگرچہ تبدیل مسلک تو کر چکے تھے مگر خود پوری طرح تبدیل (Convert) نہیں ہوئے تھے اور زندگی کے بیشتر مسائل میں ان کے خیالات پر قدیم جاہلی تصورات کا غلبہ تھا۔ اور جو لوگ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوئے تھے انکی تعلیم اور اخلاقی تربیت

ممکن نہ ہو سکی تھی کہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کو واضح طور پر سمجھ سکتے۔ ان وجوہ سے ایک نئی حرکت شروع ہو گئی جو اسلام کے مقابلہ میں جوابی انقلاب کی طاقت Counter-revolutionary force تھی۔

اس جوابی انقلاب کا پہلا ظہور حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوا۔ جاہلی تصورات رکھنے والے بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آسکتی تھی کہ جس سلطنت کو ایک شخص نے اپنی قوت بازو سے قائم کیا ہو وہ اس کے بعد اس کے خاندان کے بجائے دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے۔ وہ خاندانی فرمانروائی (Dynastic rule) کو تو سمجھ سکتے تھے کیونکہ قدیم سے یہی دیکھتے چلے آتے تھے۔ مگر اسلامی خلافت کا انقلابی تصور ان کے دماغ کی گرفت سے باہر تھا۔ وہ اللہ کے رسول کو جو بادشاہوں کی خداوندی مٹانے اور خاندانوں کی ربوبیت کا خاتمہ کرنے آیا تھا، محض ایک بانی سلطنت (Empire-builder) سمجھے اور انہوں نے چاہا کہ یہ سلطنت بھی اسی ڈھنگ پر چلے جس پر شاہان روم و عجم کی سلطنتیں چلتی آئی ہیں۔ یہ جاہلیت کی پہلی رجعت تھی اور قدیم رومی و عجمی آب و گل سے جنکی طینتیں بنی تھیں ان کو اس نے خوب اپیل کیا، مگر یہ رجعت اتنی طاقتور نہ ہو سکی کہ اسلامی نظام تمدن کی اساس میں عملاً کوئی تغیر پیدا کر دیتی۔ اس نے صرف وہ کام کیا جو کسی عمارت کی بنیادوں میں سیل اور شور کا مجموعہ کرتا ہے، یعنی یہ کہ اندر ہی اندر ان کو کھوکھلا کرتا رہے۔

دوسری اور زیادہ طاقتور رجعت وہ تھی جو حضرت علی کے عہد میں شروع ہوئی۔ جاہلی تصورات . . . . رکھنے والے ایک دوسرے گروہ کی سمجھ میں وہ خشک، بے مزہ اور بے رونق خلافت کسی طرح نہ آتی تھی جس میں نہ شاہانہ کروفر ہو، نہ خدائی کا تخت ہو، نہ بندوں کے سر جھکیں، نہ خزانے کے منہ کھلیں، نہ اَنَا اَخِیْ وَ اُمِّیت کے بے حد و حساب اختیارات ہوں۔ وہ بے لگام بادشاہی دیکھنے کے عادی تھے، وہی دیکھنا چاہتے تھے، اور وہی ان کی

سمجھ میں آسکتی تھی۔ وہ خلافت جو ابوبکر و عمر کر گئے اور جسکو حضرت علی جاری رکھنا چاہتے تھے ان کو کسی طرح اپیل نہ کرتی تھی۔ حضرت علی نے اس رجعت کو روکنے پر اپنا پورا زور صرف کیا، مگر رجعت کی پشت پر طاقت بہت زیادہ تھی اور اس وقت کی مسلم سوسائٹی میں صحیح اسلامی ذہنیت اور مضبوط کیرکٹر رکھنے والوں کی تعداد بلحاظ تناسب بہت کم تھی اسلئے حضرت علی ناکام ہوئے، اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کا آخری فیصلہ کربلا میں ہوا جس کے بعد حکومت کی طاقت کلیتہً جاہلیت کے ہاتھ میں آگئی۔

اس رجعت کے نتیجہ میں جو نظام حکومت قائم ہوا وہ اپنی روح اور اپنی صورت دونوں کے لحاظ سے خالص بادشاہی نظام تھا، مگر دانستہ یا نادانستہ اس کو "خلافت" کے نام سے موسوم کیا گیا اور کیا جاتا رہا، حالانکہ اس کو خلافت کہنا ایسا ہی ہے جیسے عرق انگور سے جو شراب بن گئی ہو اسے پھر عرق انگور ہی کہا جائے۔ اس نام نہاد خلافت میں شاہانہ خدائی کا جو رنگ تھا اس پر ظل اللٰہی کا خوشنما لفظی پردہ ڈالا گیا۔ مسلمانوں کو ان بادشاہوں کی ظاہری اقامت حدود اور اجرائے قوانین شرعیہ سے دھوکہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی، اور جو مسلمان اسلام اور جاہلیت کے نظریات کا فرق نہ سمجھتے تھے انہوں نے اس سے خوب دھوکا کھایا۔ وہ ان جاہلی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں سمجھتے رہے۔ انکے جھنڈے تلے جنگ کرنے کو جہاد فی سبیل اللہ خیال کرتے رہے۔ اور ان کی اطاعت کو اُس اطاعت امیر کا ہم معنی سمجھتے رہے جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ مگر ابتدائی دو تین صدیوں میں علماء اور ائمہ اسلام کی ایک معتدبہ جماعت ایسی موجود تھی جو پوری طرح سمجھتی تھی کہ یہ بادشاہی اسلامی نظریہ کی عین ضد ہے۔ یہ لوگ اس پر ہرگز راضی نہ تھے۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جاہلیت کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار آجانے کی وجہ سے اخلاق، معاشرت، معیشت اور اجتماعی

زندگی کے تمام پہلوؤں میں جاہلی عناصر کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے اور بتدریج تمدن کا پورا نظام جو اسلامی اصولوں پر تعمیر کیا گیا تھا، اسلام کی بنیادوں سے اکھڑ کر جاہلیت کی بنیادوں پر جمتا چلا جا رہا ہے۔ اس مکمل تدریجی انقلاب کو ٹھنڈے پیٹوں دیکھنے رہنا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا جو اسلام کو جان کر اور خوب سمجھ کر ایمان لائے تھے۔ ان کی طرف سے پیہم دو تین صدیوں تک خفیہ اور علانیہ کوششیں ہوتی رہیں کہ انقلاب کا رخ پھر جاہلیت سے اسلام کی طرف پھیر دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ کوششیں کوئی نتیجہ خیز طریق کار اختیار نہ کر سکیں۔ اول اول مقامی طور پر مسلح شورشوں (Armed revolts) کا کچھ سلسلہ جاری رہا جن کے لیے جبابرۂ وقت کے مقابلہ میں کامیابی کا امکان بہت کم تھا۔ پھر انفرادی طور پر کہیں کہیں کسی جبار کے مقابلہ میں بس کلمۂ حق کا اعلان ہوتا رہا جسکے نتیجہ میں بعض اللہ کے نیک بندوں نے جانیں تو دیدیں مگر نظام حکومت میں کوئی فرق نہ آیا۔ پھر صلحاء کے ایک گروہ نے اجتماعی اصلاح و انقلاب سے مایوس ہو کر صرف انفرادی اخلاق اور سیرت کے تزکیہ اور اعتقادات کی اصلاح پر اپنی تمام مساعی مرکوز کر دیں۔ کوئی ایسا لیڈر ان بہت سی صدیوں میں پیدا نہ ہوا جو انبیاء علیہم السلام کے طرز پر ایک عمومی تحریک (Mass movement) خالص اسلامی بنیادوں پر لے کر اٹھتا ــــ نبوت کا دعویٰ کر کے نئی امت نہ بناتا بلکہ نبی کی امت میں نبی کی وراثت کا حق ادا کرتا ــــ اور آبادی کے ایک کثیر حصہ کو ہمہ گیر دعوت انقلاب سے حرکت میں لا کر تاریخ کی رفتار پھر سے بدل دیتا۔

اخیر کے دور میں محمد ابن عبدالوہاب، حضرت سید احمد شہید اور مہدی سوڈانی نے اس طرز پر کام کرنے کی کوشش کی۔ مگر ابن عبدالوہاب کی تحریک میں اسلام کا مفہوم تنگ تھا اور حدود سے بڑھ کر اسلام کی اشکال ماثورہ پر غیر معتدل زور دیا گیا تھا اسلیے وہ ناکام ہوئی۔ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل رحمہما اللہ کی تحریک غلط فہمی کی شکار رہی۔ جن کیمکانوں

سے ان کا سابقہ تھا ان کو حقیقی مسلمان سمجھ کر انہوں نے گمان کیا کہ بس انہیں منظم کر کے نصب امارت کر دینے سے مسئلہ حل ہو جائیگا - یہ چونکہ پیش نظر مہم کا بہت کم تخمینہ (Under estimation) تھا اس وجہ سے انکی تحریک کو دردناک انجام سے دو چار ہونا پڑا - رہے مہدی سوڈانی سو انکی تحریک کو عجلت بازی اور نصب العین کی کوتاہی نے ختم کیا - جمال الدین افغانی کے اثر کی وجہ سے اسلامی انقلاب کے ایجابی نصب العین کی بہ نسبت انگریزی امپیریلزم سے اپنے ملک کو بچانے کا سلبی نصب العین ان کے دماغ پر زیادہ مستولی تھا - انہوں نے بے صبری کے ساتھ اپنی انقلابی تحریک کو نیم پختہ حالت میں ایک زبردست مادی طاقت سے قبل از وقت جا کر ٹکرا دیا لہٰذا وہی انجام ہوا جو آب زمزم کے قرابے کو پتھر پر دے مارنے کا انجام طبعاً ہونا چاہیے -

میں اس نوٹ کو مستقل مضمون نہیں بنانا چاہتا لہٰذا اس بحث کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں - یہاں بس اتنا سمجھ لیجیے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ابتدائی دور کے ان جلیل القدر مفکرین میں سے ایک تھے جنہوں نے اسلامی تحریک کے خلاف اس جوابی انقلاب کا زور توڑنے میں فکری تعاون اور عملی جد و جہد دونوں طریقوں سے اپنی پوری طاقت صرف کی یہاں تک کہ اپنی جان بھی اسی کوشش میں قربان کر دی مگر وہ ایک فقیہ تھے اور انقلابی لیڈر کا پارٹ ادا کرنے کے لیے بنائے ہی نہیں گئے تھے، لہٰذا اجتماعی انقلاب برپا کرنے کے لیے جس قسم کی کوشش اس وقت مطلوب تھی وہ نہ کر سکے - ایڈیٹر]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی،

کس قدر عجیب ہے کہ کرۂ زمین کی چالیس کروڑ آبادی کا ایک ثلث سے زیادہ حصہ اپنی مذہبی زندگی میں اسلام کے جس تشریحی مکتب خیال کا پابند ہے، یعنی حنفی مذہب، اس مکتب کے مؤسس اول اور بانی اقدم حضرت امام الائمہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر، مختلف زبانوں میں اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں لیکن جہاں تک میری محدود نظر کا تعلق ہے، حیرت ہوتی ہے، کہ امام صاحب کی زندگی کے ایک اہم

پہلو یعنی انکی سیاسی زندگی کے متعلق کسی نے اب تک مستقل طور پر کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں اور تقریباً سب ہی لکھتے ہیں کہ حضرت امام رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں جن دو حکومتوں یعنی بنی امیہ اور بنی عباس کو پایا ، ہر ایک سے آپکی مخالفت ہوئی اور شدید مخالفت ہوئی۔ بنی امیہ کے آخری گورنر عراق ابن ہبیرہ نے آپکو جیل اور تازیانے کی سخت سے سخت سزائیں دیں ، یہاں تک کہ آپکے مشہور شاگرد رشید قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ ابن ہبیرہ نے آپکے اتنے کوڑے لگوائے تھے کہ حتی قطع لحمہ (آپکے جسم مبارک کا گوشت کٹ کٹ کر گر گیا) اور اس پر تو تقریباً تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ تازیانوں کی مار کے بعد صبح کو جب جیل سے باہر نکالے گئے تو :

حتی انتفخ وجہہ وراسہ من الضرب — آپکا چہرہ مبارک اور سر مار کی شدت سے سوج گیا تھا۔

اور عباسی حکومت سے تو آخر میں آپکا اختلاف اس حد کو پہونچا کہ سب جانتے ہیں کہ اسی حکومت کے خلیفہ دوم ابو جعفر منصور کے حکم سے آپکو تازیانے کی سزا دی گئی ، ایک دن نہیں ، بلکہ مسلسل دس بارہ دن تک سیکڑوں کوڑے لگائے گئے ، پھر آپکو دو ستونوں کے درمیان لٹکایا گیا ، پھر آپکو سر بازار گشت کرایا گیا ، مدتوں جیل میں رکھا گیا ، بیچ بیچ میں پھر نکالا جاتا تھا اور تازیانے لگائے جاتے تھے ، آخر میں منصور نے تھک کر آپکو زہر پلوا دیا اور اسی زہر سے بالآخر آپکی وفات ہوئی۔ یقیناً بہت زیادہ فکر و غور ، تلاش و تجسس کی ضرورت تھی کہ آخر جس شخص کی عظمت آج ہی نہیں بلکہ اپنے عہد میں بھی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ خود اسی ابو جعفر منصور کے چچا عبد الصمد بن علی نے بھرے دربار میں ابو جعفر منصور کے سامنے یہ شہادت ادا کی تھی :-

ماذا صنعت الیوم سلت علی نفسک مائۃ الف سیف ان ھذا فقیہ اھل العراق ھذا فقیہ اھل الشرق۔ — تم نے یہ آج کیا کیا؟ اپنے اوپر ایک لاکھ تلواریں تم نے کھچوالیں۔ یہ عراق کا فقیہ ہے ، یہ تمام اہل مشرق کا فقیہ ہے (جسکو تم نے پٹوایا ہے)۔

اور صرف عباسی عہد میں امام کی جلالت قدر کا یہ حال نہ تھا۔ بنی امیہ کے عہد میں امام صاحب جب کوفہ سے فرار ہو کر مکہ معظمہ تشریف لیگئے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئیگا ، تو دیکھنے والوں نے آپکو اسلامی دنیا کے اس

مرکز میں اس شان میں دیکھا تھا مشہور محدث جلیل عبد اللہ بن المبارک کا بیان ہے -

رأیت اباحنیفہ جالسا فی المسجد الحرام یفتی اهل المشرق والغرب والناس یومئذ ناس یعنی الفقهاء الکبار وخیار الناس حضور۔

میں نے مسجد حرم میں ابو حنیفہ کو دیکھا کہ مشرق و مغرب کے لوگوں کو فتوے دے رہے ہیں، اور بڑے بڑے لوگ اس وقت معمولی آدمیوں کی طرح سامنے موجود رہتے تھے - بڑوں سے مراد بڑے بڑے فقہاء اور برگزیدہ لوگ ہیں -

۱- امام صاحب کی شہادت کے مشہور اسباب

لطف یہ ہے کہ عام تاریخوں میں امام صاحب کی سوانح عمریوں میں ان دردناک واقعات کا گو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ آخر ان حکومتوں کا طرز عمل حضرت امام کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ تو نہایت سادگی کے ساتھ اس کا جواب دیدیا جاتا ہے کہ ہر دو حکومتوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ قضا کا عہدہ قبول کریں لیکن آپ نے انکار کیا - نوکری سے اس معمولی انکار کی یہ شدید سزائیں تھیں جو آپکو دی گئیں - اولاً تو یہی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر قاضی ہونا ایسی کون سی گناہ کی بات تھی جس سے امام صاحب نے اس حد تک اجتناب روا رکھا کہ کوڑے کھائے، ٹنگائے گئے، بازار میں اپنا گشت کرانا پسند کیا، بالآخر مرنے ہی پر آمادہ ہوگئے اور بالآخر اس انکار کی وجہ سے جام شہادت بھی نوش فرمالیا - جہاں تک اسلامی روایات کا اقتضاء ہے قضا و فصل خصومات صرف یہی نہیں کہ مباح اور جائز کام ہے، بلکہ دین کے فرائض میں سے ہے، قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک بڑی غرض یہ بھی تھی کہ انسانوں کے باہمی جھگڑوں کو وہ آکر چکائیں، جیسا کہ وارد ہے :-

کان الناس امة واحدة فبعث الله النبیین مبشرین ومنذرین وانزل

لوگ ایک ہی گروہ تھے، پھر خدا نے پیغمبروں کو مژدہ سناتے ہوئے اور دھمکاتے ہوئے بھیجا اور ان کے

معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ۔

ساتھ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کتاب اتاری کہ لوگ باہم جن باتوں میں جھگڑ رہے تھے ان میں فیصلہ کریں ۔

داؤد پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ :۔

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس ۔

اے داؤد ہم نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو ۔

اور پیغمبروں کے سوا خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر اس کا حکم دیا گیا کہیں فرمایا گیا :۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ولا تکن للخائنین خصیماً ۔

اے پیغمبر ہم نے تم پر کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، تاکہ لوگوں کے درمیان فیصلے اس طرز پر کرو جیسا خدا تمہیں سجھائے اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے پیروی نہ کرو ۔

دوسری جگہ حکم ہے :۔

وان احکم بینھم بما انزل اللہ

اور اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرو ۔

قضاء اور دادرسی پر عام لوگوں کو ابھارا گیا :۔

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا ۔

تمہیں خدا حکم کرتا ہے کہ امانتوں کو ان تک پہنچاؤ جن کی امانتیں ہیں اور لوگوں میں جب فیصلے کرو، تو انصاف کے ساتھ کرو، اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے اور خوب سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے ۔

بہرحال قضاء ایک ایسا کام ہے جسے پیغمبروں نے انجام دیا ۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب تک اس دنیا میں رہے، فصل خصومات کا فرض انجام دیتے رہے ۔ آپ کے حکم سے عرب کے مختلف حصوں میں قضاۃ روانہ کیے گئے

مثلاً یمن کی طرف حضرت معاذ بن جبل کو بھیجا گیا، مکہ معظمہ کیلئے عتاب بن اسید کو مقرر کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے بعد خلفائے راشدین اس کام کو خود بھی کرتے تھے اور مختلف علاقوں کے قاضیوں کو مقرر کر کے بھیجا جاتا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام جبکہ کوئی انفرادی اور محض پوجا پاٹی دھرم نہیں تھا، بلکہ وہ ایک وسیع حاوی کامل زندہ دستور ہے جو بنی آدم کے شخصی، خاندانی، قومی، اجتماعی عام انسانی معاشی و معادی دنیاوی و اخروی تمام شعبوں پر مشتمل ہے اور اسی لیے اسلامی مذہب کو سیاسی قوانین سے جدا نہیں سمجھا جاتا، صرف نظری حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ اسلام آن واحد میں جس طرح ایک مذہبی تحریک تھا اسی طرح وہ ایک کامیاب سیاسی تحریک بھی تھا، اسی لیے ظہور اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کی بنیاد بھی پڑ گئی، اور جوں جوں یہ مذہبی تحریک آگے بڑھی، اسلامی حکومت کا دائرہ بھی اسی کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ پھر کیا کوئی کسی حکومت کا تصور اس طور پر کر سکتا ہے جس میں عدل و انصاف اور لوگوں کے باہمی نزاعات اور حقوق کے تصفیہ کا کوئی سامان نہ کیا گیا ہو؟ حکومت کے لفظی معنی ہی یہ ہیں کہ قوت کے ذریعہ سے لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض حدیثوں میں اس عہدہ کے متعلق بعض دھمکیاں بھی موجود ہیں لیکن علما کا اس پر اتفاق ہے کہ انکا تعلق محض ان لوگوں سے ہی ہے جو محض دنیاوی اغراض سے خود کوشش کر کے اس عہدہ کو حاصل کریں، یا ان لوگوں سے ہے جو اس فرض کی انجام دہی کی قابلیت نہ رکھتے ہوں پھر بھی تنخواہ کے لالچ یا عزت کی ہوس میں اس خدمت کو اختیار کر لیں۔ ظاہر ہے کہ امام صاحب کو حکومت اس عہدہ کے قبول کرنے پر آمادہ یا مجبور کر رہی تھی نہ کہ آپ اپنی خواہش سے اس عہدہ کو لینا چاہتے تھے۔ رہی یہ شق کہ امام صاحب میں اس عہدہ کی انجام دہی کی قابلیت نہ تھی۔ اگر ان میں نہ تھی تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آج تک دنیا میں کوئی صحیح معنوں میں قاضی نہ ہوا، اور نہ شائد آئندہ ہو سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امام صاحب نے انکار کے وقت خود اپنے متعلق یہ ضرور فرمایا ہے کہ انی لا اصلح لذالک (میں اس کے لایق نہیں ہوں) بلکہ اسکے متعلق یہ لطیفہ بھی مشہور ہے کہ منصور نے جب جواب میں کہا کہ نہیں، تم اسکی صلاحیت رکھتے ہو تو امام صاحب نے فرمایا:-

یا امیر المومنین اذا علمت انی اصلح وسمعتنی اقول لا اصلح فقد ظهر منی الکذب ولا یحل لك ان تستعملنی۔ کیف یحل لك ان تولی قاضیا علی امانتك وھو کذاب؟

امیر المومنین! جب آپکو معلوم ہے کہ میں اس خدمت کے لائق ہوں اور یہ بات خود مجھ سے آپ نے سنی کہ میں اسکے لائق نہیں ہوں، تو ظاہر ہے کہ میرا جھوٹ آپ پر کھل گیا۔ اب آپکے لیے کیسے جائز ہے کہ مجھے اپنی امانت قاضی بنا کر سپرد کریں بحالیکہ میں جھوٹا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ اس منطقی چکر میں آکر منصور کچھ مبہوت سا ہو گیا اور بڑبڑانے لگا،

ان ھذا یغیر الکلام بانی کذا

یہ شخص بات میں الٹ پھیر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ میں یہ بولا وہ یہ بولا

لیکن علمی حیثیت سے امام صاحب کے اس بیان کا کیا وہ مطلب ہو سکتا ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے؟ جیسا کہ میں نے کہا اگر امام صاحب میں قاضی ہونیکی صلاحیت نہیں تھی تو ان کے بعد پھر آدم کی اولاد میں کس کا جگر ہے جو اسکا مدعی ہو؟ یقیناً آپکے بیان کا وہ مقصد نہیں ہے جو بظاہر خیال کیا جاتا ہے۔ اصل واقعات اور اس مکالمہ کے تمام اجزاء جب آپکے سامنے پیش کیے جائینگے اس وقت خود کھل جائیگا کہ اس فقرہ سے آپکی اصلی غرض کیا تھی۔

بہرحال اس وقت تو میں صرف اسقدر کہنا چاہتا ہوں کہ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام صاحب نے واقعی اپنی عدم صلاحیت کی بنا پر عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا تھا، تو اس کے بعد بجائے چھوڑ دینے کے ان حکومتوں کو خواہ مخواہ اسکی کیا ضرورت تھی کہ آپکو اس نوکری پر مجبور کریں، اور اس حد تک مجبور کریں کہ شاید نوکری پر جبر و اکراہ کی تاریخ میں اسکی نظیر موجود نہ ہو؟ یقیناً جب ایک شخص اپنے کو کسی خدمت کے لائق نہیں قرار دیتا تو اس کو مجبور کرنا، دھمکانا، جیل دینا، مارنا، آخر میں مار ڈالنا، ایک مسلمان کا تو کیا شاید کسی صحیح العقل انسان کا بھی کام نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یہ کہ کسی ایک آدمی کے متعلق تو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ وہ پاگل تھا اور جنون میں امام صاحب کے انکار کی اسنے یہ سزائیں تجویز کیں۔ لیکن یہ ایک حکومت کا تو واقعہ نہیں ہے۔ یہی سلوک دوسری حکومت کا بھی آپکے ساتھ ہوا۔ کیا آخر سب کے سب پاگل اور مجنون تھے؟ ماسوا اس کے قضا کے عہدے سے انکار کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آپ اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے۔ شاید مبالغہ نہ ہو گا کہ منکرین کی فہرست بچاسوں سے متجاوز ہو سکتی ہے۔

لیکن اس قسم کا برتاؤ ان ہی حکومتوں نے آخر دوسرے منکروں کے ساتھ کیوں نہیں کیا؟ جہاں تک تلاش و تتبع سے معلوم ہوتا ہے، اس انکار کے بعد یا تو ان لوگوں کو معافی دی گئی، یا تھوڑا بہت اصرار کیا گیا۔ لیکن جب رضامندی نہیں پائی گئی تو حکومت نے بھی زیادہ پیچھا نہیں کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں کے متعلق تاریخوں میں شدت و اصرار کا ذکر پایا جاتا ہے، غور کرنے سے وہاں بھی تشدد و اصرار کی وجہ نفس ان کا انکار نہ تھا بلکہ اسکی تہ میں کچھ اور اسباب تھے۔ مگر یہ ہمارا موضوع نہیں ہے، ورنہ اسکی تفصیل بھی بتائی جاسکتی تھی۔ پھر یہ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ قضا کی خدمت اگر کوئی اسی درجہ کا گناہ کبیرہ تھا کہ اس سے کنارہ کش ہونے میں موت تک کی بازی لگائی جاسکتی ہے، اور جیسا کہ امام صاحب سے راویوں نے بیان کیا ہے کہ اس "عہدہ" کے قبول کر لینے کے انجام کی تعبیر آپ "مقامع من الحدید فی الاخرۃ" سے کرتے تھے، یعنی آپکا خیال تھا کہ اگر میں حکومت کی اس درخواست کو قبول کرونگا تو آخرت میں میرے لیے صرف لوہے کے گرز ہونگے، اور اسی لیے لوگوں کے سمجھانے پر آپ نے ابن ہبیرہ گورنر بنی امیہ کی ضرب تازیانہ کے متعلق فرمایا۔

ضربہ فی الدنیا اسہل علی من مقامع	ابن ہبیرہ کی مار دنیا ہی میں کھا لینا یہ مجھ پر زیادہ آسان
من الحدید فی الآخرۃ	ہے آخرت کے آہنی گرزوں سے۔

اگر صرف حکومت کی نوکری، یا "عہدہ قضا" کی سزا آخرت میں امام صاحب کے نزدیک یہ تھی تو پھر ان کے اکثر و بیشتر شاگردوں نے خود انکے سامنے بھی اور انکے بعد بھی اتنے بڑے گناہ کبیرہ کو کیوں اختیار کیا؟ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درجن سے زیادہ آدمی آپکے براہ راست شاگردوں میں وہی لوگ ہیں جنھوں نے قضا کی خدمت قبول کی۔ حتیٰ کہ آپکے شاگرد رشید امام ابو یوسف تو تاریخ اسلام کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہوئے۔ اور امام محمد بن حسن شیبانی کی عمر کا بیشتر حصہ اگرچہ تالیف و تدوین میں گذرا لیکن زندگی کے آخری دنوں میں وہ بھی قاضی ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں کے سوا حسن بن زیاد، حفص بن غیاث وغیرہ جیسے جلیل القدر ائمہ نے ساری زندگی قضا میں گذاری۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ وہی لوگ جو امام صاحب کے

متعلق یہ نقل کرتے ہیں کہ محض خدمت قضا سے انکار کی وجہ سے آپ کو شہید کیا گیا وہیں ان کے شاگردوں کے تذکروں میں مختلف پیرایوں میں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو امام صاحب نے ہی قضاء و افتاء کے لیے تیار کیا تھا۔ بلکہ بعضوں کے ذکر میں تو یہاں تک ہے کہ امام صاحب نے انکے متعلق پیشگوئی بھی فرمائی تھی کہ تم قاضی بنائے جاؤ گے۔ اسی بنیاد پر قاضی ابو یوسف کا وہ مشہور لطیفہ بیان کیا جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ ہونیکے بعد ہارون رشید کے مائدہ (کھانے کی میز) پر ان کے آگے ہارون نے یہ کہتے ہوئے فالودہ کا پیالہ بڑھایا جو پستہ کے روغن میں تیار کیا گیا تھا۔

کل منها فليس فى كل يوم يعمل لنا مثلها۔	اسے نوش کیجیے، ایسا ہمارے یہاں ہمیشہ تیار نہیں ہوا کرتا۔

قاضی ابو یوسف فالودہ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر کھاتے جاتے تھے اور کچھ ہنستے جاتے تھے۔ رشید نے پوچھا کہ ہنسنے کی کیا بات ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "ایک پرانا قصہ اپنی زندگی کا اس وقت یاد آیا۔ میرے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ سرپرست میری صرف والدہ تھیں۔ کچھ بڑا ہوا تو ماں نے مجھے ایک دھوبی کے یہاں نوکر رکھا دیا۔ لیکن میرا جی دھوبی کے یہاں نہیں لگتا تھا اور بھاگ بھاگ کر میں امام ابوحنیفہ کے حلقہ میں آجاتا۔ پیچھے سے والدہ آتیں اور ہاتھ پکڑ کر مجھے حلقہ سے اٹھا لیتیں اور گھسیٹ کر دھوبی کے پاس لے جاتیں۔ آخر ایک دن والدہ امام صاحب کے پاس خود آئیں اور فرمایا کہ دیکھیئے تو اس بچہ کو کیا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپکے سوا اسکو کوئی استاد ہی نہیں ملتا۔ حضور یہ بچہ یتیم ہے۔ میں بڑی مشکل سے سوت کات کات کر اسکی پرورش کرتی ہوں، چاہتی ہوں کہ خود بھی آپ پیسہ دو پیسہ کمائے۔ حضرت امام نے اس پر میری ماں کو سمجھایا اور اس وقت خدا جانے کون سا وقت تھا کہ امام صاحب کی زبان مبارک پر یہ فقرہ جاری ہو گیا:

دعيه يا رعنا فانه يتعلم اكل الفالوذج بدهن الفستق (ص۲۰۲ مفتاح و مناقب موفق)	بیوی صاحبہ اس بچہ کو چھوڑ دیجیے یہ روغن پستہ میں تیار کیے ہوئے فالودہ کے کھانے کا علم سیکھ رہا ہے۔

آج امام کے اس فقرہ کی تعبیر پا رہا ہوں اس پر بے ساختہ ہنسی آگئی"۔ ہارون کی آنکھ سے یہ سن کر آنسو جاری ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ امام صاحب کا یہ فقرہ امام ابو یوسف کے قاضی ہونے کی طرف اشارہ تھا۔ بلکہ اسکے سوا ایسی کتابوں میں نہ صرف قاضی ابو یوسف بلکہ آپکے دوسرے شاگرد جو قاضی ہوئے انکے متعلق بھی امام صاحب کی پیشگوئیاں نقل کی جاتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے حلقہ درس میں کبھی کبھی فرماتے۔

هؤلاء ستة وثلاثون رجلا منهم	یہ چھتیس آدمی ہیں، جن میں اٹھائیس قاضی ہونے کی صلاحیت
ثمانية وعشرون يصلحون للقضاء و	رکھتے ہیں، چھ مفتی ہونے کے لائق ہیں، اور دو
ستة يصلحون للفتوى و اثنان ابويوسف	یعنی ابو یوسف اور زفر تو قاضیوں کی اور مفتیوں
وزفر يصلحان لتاديب القضاة و ارباب	کی تربیت وتعلیم کے قابل ہیں۔
الفتوى (ص ۲۳۶ مناقب)	

حماد بن دلیل کا تذکرہ درج کرتے ہوئے تو صاحب "جواہر مضیئہ" نے یہ لکھ کر کہ:۔

احد الاثنى عشر من اصحاب الامام	یہ امام کے اُن بارہ شاگردوں میں سے ایک ہیں جنکے متعلق امام
الذين اشار اليهم انهم يصلحون للقضاء	صاحب نے اشارہ فرمایا تھا کہ قاضی بننے کے لائق ہیں۔

ان تمام شاگردوں کی فہرست درج کردی ہے اور وہ یہ ہے:۔

قاضی ابو یوسف، قاضی اسد بن عمر، قاضی حسن بن زیادہ، قاضی نوح بن مریم، قاضی نوح بن دراج قاضی عافیۃ، قاضی علی بن ظبیان، قاضی علی بن حرملہ، قاضی حماد۔

امام صاحب کے ایک تلمیذ نوح بن ابی مریم ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں امام صاحب سے جہاں اور مسائل دریافت کرتا ان ہی کے ساتھ زیادہ تر قضاء کے مسائل ہوتے۔ آخر ایک دن امام صاحب نے فرمایا:۔

یانوح تدق باب القضاء (ص ۱۱ موفق)	نوح تم قضاء کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہو۔

پھر جب یہ اپنے وطن مرو واپس ہوئے تو واقعی قضاء کی خدمت ان کے سپرد ہوئی - انھوں نے امام صاحب کو اسکی اطلاع دی جسکے جواب میں بجائے اس کے کہ ان کو امام صاحب منع فرماتے (اور اسکے خیال میں یہ کوئی مذہبی جرم ہوتا تو قطعاً منع کرتے) آپنے ارقام فرمایا :-

من ابی حنیفة الی ابی عصمة ورد کتابك	ابو حنیفہ کی طرف سے یہ خط ابو عصمہ کے نام ہے -
ووقفت علی جمیع ما فیه وقلدت امانةً	تمہارا خط ملا - جو کچھ اس میں تھا واقف ہوا - تم نے
عظیمة -	ایک بڑی امانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے -

آگے چند نصیحتوں کے بعد استعفار کی رائے دینے کے بجائے ایک مبسوط بحث عہدۂ قضاء کی متعلق لکھی ، جس نے بطور "یادداشت" اور "اساسی دستور" کے "حنفی فقہ" کے ایک اہم جز کی حیثیت حاصل کرلی - اس کے سوا امام صاحب کا ایک طویل "وصیت نامہ" "قاضی ابو یوسف" کے نام سے عام کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے جسکے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب قاضی ابو یوسف کو قاضی بننے پر آمادہ کر رہے ہیں ، اور اس کے بعد انکو کیا کرنا چاہیے اسکے متعلق تفصیلی ہدایتیں انھوں نے درج کی ہیں - عہدۂ قضاء کے ان دونوں "اساسی دستوروں" کے متعلق میں آئندہ تفصیلی بحث کرونگا - اس وقت مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ یقیناً یہ خیال غلط ہے کہ بالکلیہ امام صاحب "عہدۂ قضاء" کو ناجائز ٹھیراتے تھے جسکی تائید گذشتہ بالا شہادتوں سے ہوتی ہے -

سوال یہ ہے کہ جب قضاء کی خدمت گناہ کبیرہ تھی تو پھر اپنے شاگردوں کو بجائے منع کرنے کے امام صاحب نے اور انکی ہمت افزائیاں کیوں فرمائیں ؟ اور ایک حضرت امام کے تلامذہ کیا ، تقریباً آج بارہ سو سال سے اسلامی ممالک کے اکثر حصوں خصوصاً مشرقی علاقوں میں زیادہ تر منصب قضاء پر عموماً وہی لوگ سرفراز رہے جو غالی حنفی اور امام اعظم کے مکتب خیال کے برگزیدہ علماء تھے - کوئی باور کرسکتا ہے کہ اگر سرے سے قضاء کی خدمت امام صاحب کے نزدیک آہنی گرز کی مستوجب تھی تو پھر انکے ایسے زبردست متبعین ، کیا ایک سکنڈ کے لیے بھی اس کام کے لیے جرأت کرسکتے تھے ؟

حقیقت یہ ہے کہ "اسلامی تاریخ" کے ایسے اہم واقعہ کو اب تک جس بے پروائی کے ساتھ دیکھا گیا، شاید اسکی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ حالانکہ واقعات موجود تھے۔ اسباب کا پتہ آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن امام صاحب کی وفات کی وجہ ابتداء میں کسی نے انکار قضاء درج کی، آئندہ بے سمجھے بوجھے لوگ اسکو نقل کرتے چلے آئے۔ اگرچہ جہاں تک میری تلاش و تجسس کا تعلق ہے سیکڑوں واقعات کے درمیان میں نہایت سرسری طور پر بعض کتابوں میں یہ فقرہ بھی بعضوں کے قلم سے کہیں کہیں نقل ہو گیا ہے:۔

لكنهم اختلفوا في السبب فقيل كما قدمنا انه ابى القضاء فعمل به كما حكيناه وروى ان ابراهيم بن عبد الله خرج بالبصرة يدعى الخلافة فبلغ المنصور انه والاعمش كتبا اليه فكتب على لسان ابراهيم كتابا وارسله اليه فاخذ الكتاب وقبله فاتهمه المنصور في ذلك وسقاه السم واخضر وجهه ومات منه۔

(کردری ص۲۱ ج۲)

لیکن سبب کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک سبب تو وہی بیان کیا جاتا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپ نے قاضی بننے سے انکار کیا اسکی سزا میں یہ سلوک آپکے ساتھ کیا گیا۔ دوسری روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ نے بصرہ میں علم بغاوت خلافت کے مدعی ہو کر بلند کیا، منصور کو یہ خبر پہونچی کہ ابو حنیفہ اور اعمش نے ابراہیم کو کچھ لکھا ہے منصور نے جعلی طور پر ابراہیم کے نام سے ایک خط لکھوا کر امام صاحب کے پاس بھیجا۔ امام نے اس خط کو لیا اور بوسہ دیا۔ منصور نے اس بنیاد پر آپ کو متہم ٹھیرایا، اور اسکی سزا میں زہر پلوا دیا جسکی وجہ سے آپکا چہرہ نیلا پڑ گیا اور اسی سے انتقال ہوا۔

اسی کے قریب قریب بعض کتابوں میں ایک اور بات ملتی ہے۔ حالانکہ حنفی مذہب کے ایک جلیل القدر امام کی یہ روایت تھی لیکن نہ معلوم کیوں محض سرسری طور پر بعض کتاب کے گوشوں میں اسے درج کیا گیا۔ صدر الائمہ علامہ ابو المؤید موفق الدین المکی اپنے مناقب میں لکھتے ہیں کہ سمرقند سے امام ابو حفص عمر بن احمد النسفی نے اور بخارا سے محمد بن حسن الختنی و حماد بن ابراہیم نے مجھے یہ لکھ کر بھیجا کہ امام ابو عبداللہ محمد بن ابی حفص

کبیر جو متقدمین علماء احناف کے بڑے رکن ہیں، ان سے متصل سند کیساتھ یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ۔

دخل حسن بن قحطبه احد قواد ابی جعفر المنصور علی ابی حنیفة فقال له انا ممن تعلم وعملی لا یخفی علیك۔ فهل لی من توبة؟ قال نعم۔ فقال ماهیه۔ قال ان یعلم الله عز وجل نیتك نیة صادقة انك نادم علی ما فعلت واخذت، وانك اذا خیرت بین ان تقتل مسلماً او تقتل تختار قتلك علی قتله، وتجعل الله عز وجل علی نفسك عهداً ان لا تعود الی شیء ما کنت فیه، فان وفیت فهی توبتك۔ فقال الحسن فانی قد فعلت ذلك وعاهدت الله تعالی ان لا اعود فی شیء ما کنت فیه من قتل المسلمین۔ فکان فی ذالك الی ان ظهر ابراهیم بن عبدالله بالبصرة من اهل البیت۔ فارسل الیه ابوجعفر وامره بالمسیر الیها۔ فجاء الی ابی حنیفه رحمة الله فقال یا اباحنیفة شیٔ امرنی

ابو جعفر منصور کا ایک جرنیل جس کا نام حسن بن قحطبہ تھا امام ابو حنیفہ کے پاس آیا اور بولا جس گروہ سے میرا تعلق ہے آپ جانتے ہی ہیں اور جو کچھ میرا کاروبار رہا ہے اس سے بھی آپ واقف ہیں۔ پھر کیا میری توبہ کی بھی کوئی شکل ہو سکتی ہے؟ امام نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کیا صورت ہے؟ فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے تم سچی نیت کے ساتھ حاضر ہو جاؤ اور واقعی تم کو اپنے پچھلے کرتوتوں پر سچی ندامت ہو جو کچھ تم نے کیا اور لیا دیا ہے اس سے شرمندہ ہو اور اس طرح نادم و شرمندہ ہو کہ اب اگر تمہیں کسی مسلمان کے قتل کرنے کا اور خود اپنے قتل ہونے کا اختیار دیا جائے، تو تم اپنے قتل ہونے پر آمادہ ہو جاؤ، اور اللہ سے اسکا معاہدہ کرو کہ جس حال میں تم تھے اب آئندہ اسکی طرف واپس نہ ہو گے، تم نے اگر اپنے اس معاہدہ کو پورا کر دیا تو تمہاری بھی توبہ ہو جائیگی۔ حسن نے کہا اچھا تو میں یہی کرتا ہوں اور اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے قتل کا کبھی ارتکاب کرونگا۔ حسن اسی حال میں تھا کہ ابراہیم بن عبداللہ کا ظہور بصرہ میں ہوا جو اہلبیت میں سے تھے۔ ابو جعفر نے حسن کو کہلا بھیجا کہ فوراً ابراہیم کے مقابلہ کیلیے بصرہ روانہ ہو جاؤ۔ حسن اس حکم کے بعد ابو حنیفہ

الخليفة بكذا وكذا ۔ فقال فقد جاءك اوان
توبتك ۔ اما انت فقد عاهدت الله
ما قد علمت ۔ فان وفيت له ارجوان يتوب
الله عليك ۔ وان عدت اخذت بما
مضے من ايامك وما بقي ۔ فقال الحسن
اللهم انى بما عاهدت لك ۔ فاوصى
وتهيأ للقتل ودخل على ابي جعفر فقال
له واستعفى واعتل ۔ فلم يقبل منه ۔
فقال يا امير المومنين انى لست بسائر
الى هذا الوجه ۔ ان كان لله طاعة فمن
قتلت فى سلطانك فلى منه اوفر الحظ
وان كان معصية فحسبى ما قتلت ۔
فغضب ابوجعفر من ذالك ووثب
اخوه حميد وقال يا امير المومنين
انا انكرناه منذ سنة وتخوفنا عليه ان
يكون قد خالط ۔ فانا اسيروانا احق
بالفضل منه ۔ فسار حميد وقال ابو
جعفر لاهل ثقاته تعاهدوا الحسن على
من يدخل من هؤلاء الفقراء (الفقهاء)

کے پاس آیا اور بولا بڑی بُری خبر ہے ۔ خلیفہ نے ایسا ایسا
مجھے حکم دیا ہے ۔ امام نے فرمایا! دیکھو تیری توبہ کا وقت آگیا
تونے خدا سے جو معاہدہ کیا ہے اسے تو جانتا ہے ، اگر
اب اس عہد کو پورا کریگا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ حق
تعالیٰ تیری توبہ قبول فرمائینگے اور اگر پھر تم اسی حالت
کی طرف پلٹ گئے ، اور اسی پیشہ کو اختیار کیا ، جو گذشتہ
زمانہ میں تم کرتے تھے ، تو پچھلے گناہوں میں بھی پکڑے
جاؤگے اور اگلے گناہوں میں بھی ۔ حسن نے کہا اے خدا
جو میں نے تجھ سے عہد کیا ہے اسے پورا کرتا ہوں ۔ اس کے
بعد اس نے وصیت کی اور خود قتل ہونیکے لیے تیار ہو کر ابو
جعفر منصور کے دربار میں حاضر ہوا اور اس کام سے اس نے
معافی چاہی ۔ کچھ عذر پیش کیا ۔ لیکن ابوجعفر نے قبول نہیں
کیا ۔ حسن نے کہا امیر المومنین ! اس مہم پر میں تو کبھی روانہ نہیں
ہوسکتا ، کیونکہ جن لوگوں کو اب تک میں آپکی حکومت کے زیر فرمان
قتل کر چکا ہوں اگر یہ کوئی نیک کام تھا تو اس نیک کام کا ایک
بڑا حصہ مجھے حاصل ہو چکا ہے ۔ اور اگر گناہ تھا تو حضور
بس اتنے انسانوں کا قتل کرنا میرے لیے کافی ہے ۔ ابوجعفر
یہ سنکر غضب ناک ہوا ۔ اتنے میں اُچک کر حسن کا بھائی
منصور کے سامنے آیا اور بولا کہ حضور اس شخص کی

او من یدخل علیه ومن هذا الذی یفسد علینا هذا الرجل - فاخبروه انه یدخل علی ابی حنیفة رحمه الله فدعاه بعلة شیء فسقاه فمات رحمه الله وسقی الحسن فعالج نفسه فنجا [۱۰۳]

حالت تقریباً ایک سال سے ہم لوگ بگڑی ہوئی پا رہے ہیں اور جب سے ہم لوگوں کو اندیشہ تھا کہ اسکے اندر کچھ خلل پیدا ہو گیا ہے - بہر حال میں اس مہم پر روانہ ہوتا ہوں اور بزرگی کا میں اس سے زیادہ حقدار ہوں - حمید یہ کہکر مہم پر روانہ ہوا - منصور نے اپنے معتبر درباریوں سے کہا کہ اس بات کی ٹوہ لگاؤ کہ شہر کے ان فقیہوں میں سے کس کے پاس اسکی آمد رفت ہے یا کون اسکے پاس آتا جاتا ہے اور یہ کون ہے جو ہماری حکومت میں بگاڑ و فساد پیدا کرتا ہے - لوگوں نے اطلاع دی کہ اس کا تعلق امام ابو حنیفہ سے ہے یہ سنکر منصور نے امام صاحب کو ایک بہانہ سے بلایا اور زہر پلایا جسکی وجہ سے آپ کا انتقال ہوا -

بعض کتابوں میں امام صاحب کے مشہور شاگرد زفر بن ہذیل کی زبانی ایک اور روایت بھی اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہے -

عن زفر بن هذیل قال کان الامام یجهر بالکلام ایام ابراهیم جهاراً شدیداً فقلت ما انت بمنتهٍ حتی توضع الحبال فی اعناقنا فلم یلبث یسیراً حتی جاء کتاب المنصور الی عیسی بن موسیٰ ان احمل ابا حنیفة الینا فحمل بغداد فعاش خمسة عشر یوماً ثم سقاه السم فمات رحمة الله علیه ص ۱۷۱ موفق -

زفر کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ ابراہیم کی بغاوت کے زمانے میں علانیہ شدت و زور شور کیساتھ اسکی تائید میں باتیں کیا کرتے تھے (لوگوں کو ان کا ساتھ دینے پر ابھارتے تھے) - میں نے عرض کیا شائد آپ اس طرز عمل سے اس وقت تک نہ رکیں گے جب تک کہ ہماری سب کی گردنوں میں رسیاں نہ پڑ جائیں - میری اس گفتگو کے چند ہی دنوں بعد منصور کا فرمان عیسیٰ بن موسیٰ کے نام آیا کہ ابو حنیفہ کو فوراً ہمارے پاس روانہ کرو - امام کو بغداد روانہ کر دیا گیا - پندرہ دن آپ وہاں رہے ہونگے کہ ایک دن آپکو زہر پلا دیا گیا - اسی میں وفات ہوئی -

یافعی نے اس پر اضافہ کیا ہے (ویامر بالخروج معہ حتی[۳۰۸]) - یعنی امام صاحب لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے پر اُبھارتے تھے۔

امام صاحب کی شہادت کے اسباب میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض بعض تاریخوں میں یہ چند بیانات بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن عام طور سے مورخین نے چونکہ انکار قضاء کے سبب ہی کو اُجاگر کرکے بیان کیا اس لیے زیادہ تر آپکی وفات کی وجہ میں اسی نے شہرت حاصل کی۔ لیکن ان بیانوں سے بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عباسی حکومت کے مظالم کا تعلق اس سیاسی معاملہ سے تھا۔ مگر بنی اُمیہ کے عہد حکومت میں جو آپ پر زیادتیاں کی گئیں اُنکے متعلق تو اتنی تصریح بھی نہیں ملتی۔ بلکہ ابن ہبیرہ کے مظالم کی داستان جہاں کہیں بیان کی گئی اس میں بس "حکومت کی نوکری" سے انکار ہی کو واحد سبب قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے ابن ہبیرہ نے آپ پر قضاء پیش کی۔ جب اس سے انکار کیا تو آپ کو بیت المال کا افسر مقرر کرنا چاہا اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو تسجیل (رجسٹراری) یعنی گورنر کے احکام پر مہر لگانے کا کام آپکو پیش کیا گیا۔ جب اس سے بھی آپنے انکار کیا تب اس نے آپکے ساتھ وہ تعدیاں کیں جنکا اجمالاً ذکر پہلے ہی آچکا ہے اور آئندہ تفصیل سے آئیگا۔ گویا سب کا حاصل یہ ہوا کہ بنی اُمیہ کی حکومت سے آپکا کوئی سیاسی اختلاف سرے سے تھا ہی نہیں۔ اور عباسی دور میں آپکا حکومت وقت سے اختلافی تعلق صرف ایک موقعہ پر ثابت ہوتا ہے یعنی جب ابراہیم بن عبداللہ نے منصور کے خلاف علم بلند کیا۔ گویا ستر سال کی زندگی میں ایک موقع ہے جہاں آپنے اس سیاسی مسئلہ سے دلچسپی لی۔ گویا لے دے کر آپکا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ ساری زندگی میں ایک ہی ہے۔ امام صاحب کی سوانح عمریوں یا دوسری تاریخی کتابوں کے پڑھنے سے امام کی سیاسی زندگی کے متعلق جو اثر عام طور سے دماغوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ صرف یہی ہے۔ لیکن کیا یہی واقعہ بھی ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ امام صاحب کے ساتھ دونوں حکومتوں کی جانب سے ایسے جگر شگاف دل ہلا دینے والے مظالم توڑے جاتے ہیں اور لوگ اسکو محض کسی مقامی امیر یا کسی خلیفہ وقت کے وقتی عتاب کا نتیجہ یا راج ہٹ

کا نتیجہ قرار دے لیتے ہیں۔ حالانکہ "واقعات" موجود تھے۔ لیکن انکو باہم ایک دوسرے سے مربوط کرکے نتیجہ نکال لینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

۲۔ امام صاحب کے عہد کی سیاسی تاریخ

امام صاحب کی "شہادت" کے متعلق جن اسباب و وجوہ کا تذکرہ تاریخ میں صراحتہً کیا گیا ہے وہ تو یہی تھے جو قارئین کرام نے ملاحظہ فرمالیے۔ اب میں آپکے سامنے چند واقعات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہوں جن سے نہ صرف امام صاحب کی "شہادت" کے حقیقی اسباب پر روشنی پڑتی ہے بلکہ امام اعظم کی اس عظیم قربانی پر جو انقلابی نتائج مرتب ہوئے انشاءاللہ تعالیٰ وہ بھی آپکے سامنے آجائینگے۔

اب تک اس سلسلہ میں جن باتوں کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں یہ دو واقعے بھی ہیں۔ ایک یہ کہ عباسی حکومت کے مقابلہ میں جب ایک علوی امام حضرت ابراہیم نے علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحب پوشیدہ طریقہ ہی سے نہیں بلکہ علانیۃً و جہراً انکی اعانت پر لوگوں کو آمادہ فرماتے تھے۔ دوسرے یہ کہ عباسی حکومت کا سب سے بڑا مشہور جنرل حسن بن قحطبہ محض آپکے مشورہ سے متاثر ہو کر حضرت ابراہیم کے مقابلہ میں جنگ کرنے سے رک گیا تھا۔

اسی کے ساتھ کتابوں میں عام طور پر یہ واقعہ بھی درج ہے کہ بنی اُمیہ کے زمانے میں ہشام بن عبدالملک خلیفہ کے مقابلہ میں جب حضرت زید بن علی نے خروج کیا تو اس وقت بھی امام صاحب حضرت زید کے طرفداروں میں تھے اور ایک خطیر رقم سے ان کی فوجی مہم میں امداد فرمائی۔ اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئیگا۔

کم از کم ان واقعات سے اتنا تو اب بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب کے علم و زہد نے دین و ملت کی سیاسی ضرورتوں سے انکو بے حس بنا کر نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ حلقۂ درس، تسبیح و مصلی کے ساتھ ساتھ آپ کی نگاہیں بادشاہوں کے تخت اور حکومتوں کے اس طرز عمل پر بھی رہتی تھیں جس کا اثر اس پیغام پر پڑتا تھا جسے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں نے وراثتہً اس معاہدہ کے ساتھ پایا ہے کہ "جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کے مصائب و آفات سے اسے بچاتے ہوئے ایک نسل دوسری نسل کو سونپتی چلی جائیگی"۔ اور اس میں حضرت امام کی تقلید کے ان مدعیوں کے لیے عبرت ہے، جو امام کی تقلید کو صرف آمین و رفع الیدین کے مسئلوں تک محدود کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ان مسائل کی تنقیح و تنقید کے بعد ان کے ذمہ دین و ملت کا کوئی فرض باقی نہیں رہتا۔

امام کی ولادت باسعادت بنی اُمیہ کے اُس عہد میں ہوئی تھی جب سارا عالم اسلام ان کے خونچکاں مظالم سے تھرا رہا تھا۔ دُنیا کے ان متوالوں سے وہ سب کچھ سرزد ہو چکا تھا جسکی نظیر اسلام ہی کیا شاید تاریخ عالم میں موجود نہیں۔ فرات کے ساحل پر اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے اور ان کے خاندان کے پیاسے شہیدوں کے بہتے ہوئے لہو سے یہ اپنی حرص و آز کی پیاس بجھا چکے تھے۔ رسول کا منورہ و پاک شہر حرہ کے واقعہ میں لوٹا جا چکا تھا اور اس بُری طرح لوٹا جا چکا تھا کہ جان و مال ہی نہیں بلکہ عصمتیان حرم کی آبرو و ناموس تک کی پروا نہیں کی گئی۔ رسولؐ کی مسجد میں سعید بن المسیب کے سوا ایک زمانے تک نماز پڑھنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اللہ کا گھر کعبہ تک بھی دنیا طلبی کی اُس بھٹی کی چنگاریوں سے نذر آتش ہو چکا تھا جو اس خاندان کے سینوں میں جل رہی تھی۔ خلافت اسلامی کے پہلے خلیفہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر بیت اللہ کی چوکھٹ پر اُن ہی کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپ چکے تھے "ظالم الامتہ" حجاج کی بے پناہ تلوار لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں معمولی معمولی باتوں میں اُڑا چکی تھی جن میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے۔

الغرض بنی اُمیہ اور انکے سنگدل و سیاہ سینہ ولاۃ (گورنروں) کی بدتمیزیوں کے اس بے پناہ طوفان نے ایک ایسا دہشتناک مہیب منظر دُنیائے اسلام میں قائم کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر دم بخود تھا۔ منکرات دیکھے جا رہے تھے لیکن ہاتھ سے روکنے کی جرأت کسی کو کیا ہوتی، بڑے بڑوں کی زبانیں تک خاموش تھیں۔ یزید، ابن زیاد اور حجاج جیسے رسوائے زمانہ ہی نہیں بلکہ جو اُن میں نیکی اور حلم و بردباری میں

شہرت رکھتے تھے ان کے درباروں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اُسکا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ عبد الملک بن مروان (جو اپنی مذہبی زندگی میں خاص امتیاز رکھتا تھا) کے پاس بوڑھے اور نابینا صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالٰے عنہ مدینہ طیبہ سے چل کر دمشق صرف اس لیے آتے ہیں کہ واقعہ حرہ کے بعد انتقاماً مدینہ منورہ والوں پر جو ظلم توڑے جارہے تھے ان کو بند کرنے کی درخواست کریں۔ اس وقت رسول اللہ کے پڑوسیوں پر زندگی کے تمام ذرائع بند کر دیئے گئے تھے۔ ہر شخص گویا اپنے گھر میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رسولؐ کے صحابی اس پر رحم کی سفارش لیکر آتے ہیں اور خلیفہ عبد الملک سے کہتے ہیں:-

یا امیر المومنین ان المدینة حیث تری وھی طیبة سماھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم واھلھا محصورون فان رأی امیر المومنین ان یصل ارحامھم ویعرف حقھم فعل (ابن سعد)	امیر المومنین! مدینہ منورہ جس حال میں ہے آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ "طیبہ" (یعنی پاک شہر) ہے۔ یہ نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا رکھا ہے۔ اس کے باشندے آج کل قیدیوں کی طرح محصور ہیں۔ امیر المومنین کو اگر صلہ رحمی کا خیال ہو اور انکے حق کو وہ پہچانیں تو ایسا کرنا چاہیے۔

پیغمبر کے ایک صحابی پیغمبر کے شہر کے بے قصور باشندوں، بچوں اور عورتوں پر رحم کی درخواست پیش کرتے ہیں لیکن بجائے سمجھنے کے عبد الملک کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑکنے لگی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ حضرت چونکہ نابینا تھے اس لیے انکو اسکی ناراضی کا پتہ نہ چلا۔ آپ بار بار اسی بات کو دہرا رہے تھے۔ قریب تھا کہ انکے ساتھ بھی کوئی سخت واقعہ پیش آئے لیکن اتفاق سے دربار میں ان کے ایک شاگرد قبیصہ موجود تھے۔ انھوں نے حضرت کو خاموش کیا۔ ہاتھ پکڑ کر باہر نکال لائے اور حضرت کو سمجھانے لگے کہ

یا ابا عبد اللہ ان ھؤلاء القوم صاروا ملوکا (ابن سعد)	حضرت یہ لوگ (بنی امیہ) اب بادشاہ بن گئے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کیا ابھی تک ان لوگوں کو واقعی مسلمانوں کا امیر اور خلیفہ ہی سمجھ رہے ہیں۔ یہ اپنے کو اب رسول کا جانشین نہیں سمجھتے بلکہ گذشتہ رومی اور ایرانی سلاطین کے نقش قدم پر چل کر انھوں نے اپنے کو بادشاہ بنالیا ہے۔ قبیصہ پر عبد الملک چونکہ بہت بھروسہ کرتا تھا اور یہ بات مشہور تھی اس لیے حضرت جابر نے یہ سن کر قبیصہ سے فرمایا:۔

فانه لا عذر لك وصاحبك يسمع منك۔ — مگر تم کو کوئی عذر کا موقع حاصل نہیں ہے کیونکہ تمہارا صاحب تمہاری بات تو سنتا ہے۔

اس پر قبیصہ نے جو بات کہی اس سے ان خلفاء کے طرز عمل کی کیسی اچھی تشریح ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا:۔

يسمع ولا يسمع ما وافقه يسمع (ابن سعد) — حضرت! وہ سنتا بھی ہے اور نہیں بھی سنتا ہے۔ جو بات منشا اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے بس اسی کو سنتا ہے۔

مروانی خاندان کے پہلے خلیفہ کا یہ حال تھا۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعد کے خلفاء جنھوں نے سلطنت ہی کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں ملوکیت میں ان کا رنگ کتنا گہرا ہوتا چلا گیا ہوگا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت کوفہ یعنی امام صاحب کے مولد کی تھی کہ اسی شہر میں مدت تک ابن زیاد اور اس کے بعد حجاج کی تلوار اپنے نیام سے باہر ہو کر بیکسوں اور مظلوموں کے سر پر مسلسل بیس سال تک انتہائی بے دردی کے ساتھ چلتی رہی۔ کوفہ والے کس حال میں تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے استاذ کے استاذ حضرت ابراہیم نخعی کو جب حجاج کی موت کی خبر پہونچی تو وہ سجدہ میں گر گئے اور بیان کیا جاتا ہے کہ انکی آنکھوں سے مسلسل خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "لوہے کی عصا" سے ایسی حکومت قائم کی گئی تھی جس میں زبان سے کسی اصلاحی لفظ کا نکالنا اپنے خون سے کھیلنا تھا اور اسی لیے بڑے بڑوں کے پائے استقلال اپنی جگہ سے ہل کر بجائے کھڑے ہونے کے بیٹھنے کو ترجیح دے چکے تھے۔ خواجہ حسن بصری یا ابن سیرین، ابراہیم نخعی یا شعبی جیسے ائمہ عظام کے لیے

خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا (جسکی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے) - یہ واقعہ ہے کہ ایک خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ حکومت کی قہرمانیت و استبداد سے یہی لیل و نہار رہینگے تو آئندہ نسلوں میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جذبہ جسکی قرآنی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و خلفاء راشدین کے طرز عمل نے مسلمانوں میں پرورش کی تھی ہمیشہ کے لیے بجھ کر رہ جائیگا جس کا آخری مآل اسکے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ نبوت نے جو اسلامی نظام قایم کیا تھا محو ہو کے ان غلام بادشاہوں اور انکے عمال و حکام کے ہاتھوں بتدریج مسخ ہوتے ہوتے درہم و برہم ہو کر رہ جاتا۔

غالباً حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ اپنی عمر کے اٹھارہویں سال میں تھے کہ اسلام کے متعلق وہی تجربہ جسکی شہادت تیرہ سو سال سے اسلامی تاریخ مسلسل ادا کر رہی ہے ظاہر ہوا۔ یعنی اسلام کی کشتی جب کبھی نزاکت کے آخری گرداب میں اس طرح پھنسی ہے کہ دیکھنے والوں نے ہمیشہ کے لیے اسکے ڈوب جانے کی پیشگوئی کی تو اچانک کسی غیبی لطیفہ نے ظاہر ہو کر انا لہ لحافظون کی توثیق کرتے ہوئے نا امیدی کی ان مایوسانہ پیش قیاسیوں کو ہمیشہ جھٹلا کر رکھدیا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا بنی امیہ کے اپنی مردہ لاشوں میں سے جنھوں نے خواہ "سیاسی" طور پر جس قسم کی زندگی کا ثبوت دیا ہو لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں اکثر مردہ ہو چکے تھے، اور اس حد تک مردہ ہو چکے تھے کہ ان ہی اموی خلفاء میں سے ایک نے اپنی ایک ناپاک کنیز کو بحالت جنابت عبا اور عمامہ پہنا کر مسجد میں امامت کے لیے بھیجا اور بیچارے ناواقف مسلمانوں کو اسی بدمست و ناپاک عورت کے پیچھے نماز پڑھنی پڑی۔ لیکن "مخرج الحی من المیت" کی یہ عجیب شان ہے کہ ان ہی مردہ ضمیروں میں سے اس نے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ کو اموی تخت کا وارث بنایا جسکی ایمانی زندگی نے نئے سرے سے اسلامی نظام کے تمام شعبوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا امام صاحب کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا جس وقت عمر بن عبد العزیز نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ پہلی تقریر منبر پر پہونچکر انھوں نے جو کی اس کا سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ:-

لا طاعة لنا في معصية الله (ابن سعد) اللہ کی نافرمانی میں ہماری فرماں برداری کوئی نہ کرے۔

آزادی کا یہ پہلا منشور تھا جس کا بنی اُمیہ کے عہد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے پہلی دفعہ اعلان کیا گیا۔ تمام ظالم گورنر جن کے حالات سے وہ بخوبی واقف تھے ایک ایک کر کے ہٹا دیئے گئے۔ ہر شخص کو حکم دیا گیا کہ "اسلامی نظام" میں جہاں جہاں جس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور پوری قوت سے کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری زبانیں جن پر تلوار کے تانے چڑھائے گئے تھے کھل پڑیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر و اظہار حق کے جذبہ کا جو چراغ قریب تھا کہ بجھ جائے، پھر سینوں میں روشن ہو گیا۔ مشہور مدنی امام حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر کا مشہور تاریخی فقرہ۔

الیوم ینطق من کان لا ینطق (ابن سعد) اب وہ بولیں گے جو نہیں بول سکتے تھے۔

خلافت عمری کے اسی اعلان آزادی کا ترجمہ ہے۔ ایک طرف عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں لوگوں کو یہ آزادی میسر آئی، دوسری طرف ایک اور انقلاب کی ابتدا ان ہی کے زمانے سے شروع ہوئی۔ وہ یہ کہ بنی اُمیہ کی غیر اسلامی زندگی کا ایک اثر عام لوگوں پر یہ بھی پڑا تھا کہ شرعی علوم یعنی قرآن و حدیث اور ان سے مسائل استنباط کرنے کا عام رجحان جسے فقہ کہتے ہیں بہ تدریج کم ہوتا جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ علوم کی ترویج و اشاعت میں ضرورت کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ لوگوں میں اسلامی زندگی گذارنے کا جب شوق ہی مردہ ہو چلا تھا تو ظاہر ہے کہ اسکی ضرورت بھی کم ہو رہی تھی۔ جیسا کہ خود امام صاحب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے عام لوگوں کی توجہ شرعی علوم سے ہٹ کر شعر و شاعری ادب وغیرہ کی طرف مائل تھی دینی علوم میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہو گئی تھی جن پر فلسفیانہ رنگ غالب تھا جسے اس زمانہ میں علم کلام کہتے تھے۔ گویا دین بھی ایک قسم کی ذہنی عیاشی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ خود امام اعظم کا ابتدائی حال بھی یہی تھا جیسا کہ خود بیان کرتے ہیں :۔

کنت اعد الکلام افضل العلوم وکنت اقول ھذا الکلام فی اصل الدین (مناقب کردری)

ابتدا میں میرا حال یہ تھا کہ میں کلام کو تمام علوم میں سب سے بہتر علم خیال کرتا تھا کہ اس میں تو دین کی بنیاد کی گفتگو کی جاتی ہے۔

اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ جس قسم کی فطری ذکاوت وذہانت سے کر امام صاحب آئے تھے اُس نے ان فلسفیانہ موشگافیوں میں آپ کی دلچسپی کو اتنا تیز کر دیا تھا کہ

حتی صار أسانی ذالك منظورًا الیه (مناقب) امام صاحب اپنے زمانہ میں اس علم کے رئیس ہو گئے لوگوں کی نگاہوں کے مرکز بن گئے۔

تعلیمی سوانح کو بیان فرماتے ہوئے امام صاحب خود اپنے کلامی شوق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے تھے

کنت رجلا اعطیت جدلا فی الکلام فمضی دھر فیه اتردد به اخاصم وعنه اناضل۔ میں دراصل ابتدا میں ایسا آدمی تھا جسے "علم کلام" میں مقابلہ ومجادلہ کا ذوق تھا۔ اس سلسلہ میں ایک زمانہ گذر گیا کہ اسی کے پیچھے میری تگ ودو تھی، اسی فن میں لوگوں سے مقابلہ کرتا اور چیلنج دیتا۔

جوانی کے اس شوقِ بے پروا میں آپ جب کوفہ کے میدان کو تنگ پاتے تو بصرہ تشریف لے جاتے جو اس زمانے میں علم کلام کا سب سے بڑا دنگل تھا، اور وہاں بڑے بڑے جبادریوں سے پنجہ آزمائی فرماتے۔ خود ہی بیان فرماتے ہیں۔

وکان اصحاب الخصومات والجدل اکثرها بالبصرة فدخلت البصرة نیفا وعشرین مرة منها ما اقیم سنة و اقل واکثر۔ لڑائی جھگڑے کرنے والوں کی بڑی جماعت بصرہ میں رہتی تھی۔ میں تقریباً بیس دفعہ بصرہ اسی غرض سے گیا اور وہاں کم وبیش سال سال بھر قیام کیا۔

اس قسم کے بے معنی مباحث میں مسلمانوں کے اُلجھے رہنے سے چونکہ حکومت کا کچھ نہیں بگڑتا تھا بلکہ طرح طرح کی فرقہ بندیوں کی اس سے بنیاد پڑتی تھی جس سے "فَرِّقْ وَاحْکُمْ" (پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو) کے سیاسی نظریہ کی تکمیل ہوتی تھی اس لیے حکومت بھی اس قسم کے جھگڑوں میں دخل نہیں دیتی تھی، بلکہ ممکن ہے کہ

حوصلہ افزائی کرتی ہو۔ امام صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ اس زمانہ میں مختلف کلامی فرقوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

وقد كنت نازعت طبقات الخوارج من الاباضية والصفرية وغيرهم وطبقات الحشو۔	میں نے بصرہ میں خارجیوں کے مختلف فرقوں مثلاً اباضیہ اور صفریہ سے مقابلے کیے اور بھی مختلف حشوی طبقات سے مباحثے رہے۔

ان فلسفیانہ خیالات والوں کا کیا حال تھا اس کی شہادت بھی امام ہی کی زبانی سننا چاہیے۔ اپنے ان ذہنی مباحث کو دینی رنگ دینے کے لیے ان لوگوں نے اس کا نام کلام رکھا تھا لیکن ان کا جو حال تھا امام صاحب بیان فرماتے ہیں:۔

قوم ليس سيماهم سيماء المتقدمين ولا منهاجهم منهاج الصالحين رأيتهم قاسية قلوبهم غليظة افئدتهم لا يبالون مخالفة الكتاب والسنة والسلف الصالح ولم يكن لهم ورع ولا تقى (موفق)	نہ انکی صورتیں پرانے بزرگوں کی سی تھیں اور نہ ان کا طریقہ صالحین کا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ان کے دل سخت ہیں اور ان کے قلب بے حس ہیں۔ ان لوگوں کو کتاب وسنت کے خلاف بات کہتے میں ذرا باک نہ تھا۔ نہ ان میں تقویٰ تھا نہ خدا ترسی تھی۔

مسلمانوں کا یہ میلان آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اگرچہ ابھی ملک قرآن وحدیث وفقہ کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہوا تھا لیکن خدانخواستہ اگر بیچ میں یکایک عمر بن عبدالعزیز کی حکومت قایم نہ ہو جاتی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا ہوتا؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جس طرح اپنے پہلے خطبہ میں خلفا کی اطاعت کی وہ نوعیت بیان کی تھی جو اوپر مذکور ہوئی اسی طرح انھوں نے پورے عزم اور کامل ارادہ کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا:۔

فلو كان كل بدعة يميتها الله على يدي وكل سنة يبعثها الله على يدي ببضعة	اگر حق تعالیٰ ہر بدعت کو میرے ہاتھوں سے مردہ کرے اور ہر سنت کو میرے ہاتھوں پر زندہ کرے اور اس راہ

لحمي حتى يأتي آخر ذلك على نفسي كان في الله يسيرا (ابن سعد)

میں میرے جسم کا ایک ایک ٹکڑا کام آئے یہاں تک آخر میں میری جان کی نوبت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ بہت ہی معمولی قربانی ہوگی۔

اس باب میں ان کے شغف کا یہ حال تھا کہ عاملوں اور گورنروں کے جو فرامین پایۂ خلافت سے ان کے زمانہ میں جاری ہوئے تھے ان کے متعلق مورخین کا بیان ہے:۔

الا فيه رد مظلمة او احياء سنة او اطفاء بدعة او قسم او تقدير عطاء او خير حتى خرج من الدنيا (ابن سعد)

ان میں یا تو کسی ظلم کا ازالہ ہوتا یا کسی سنت کے زندہ کرنے کا حکم یا کسی بدعت کے مٹانے کا فرمان، یا کسی کا وظیفہ مقرر ہوتا، یا کوئی نیکی کی بات (یہ اسوقت تک ہوتا رہا) جب تک وہ دنیا سے روانہ ہوئے۔

ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبائع کا رخ پلٹ گیا۔ قرآن و سنت کی طرف سے جو رجحان گھٹ رہا تھا پھر اس میں نیا جوش اور نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب پر بھی اس عام تحریک کا اثر پڑا۔ خود فرماتے ہیں کہ علم کلام کی ان ہی دلچسپیوں میں میں مستغرق تھا کہ اچانک میرا خیال بدل گیا اور:۔

فراجعت في نفسي بعد ما مضى لي فيه عمر وتدبرت فقلت ان المتقدمين من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم والتابعين و اتباعهم لم يكن يفوتهم شيء مما ندركه نحن وكانوا عليه اقدر وبه اعرف واعلم بحقائق الامور ثم لم ينتصبوا فيه منازعين ولا مجادلين ولم يخوضوا فيه بل امسكوا عن

ایک مدت علم کلام کی بحثوں میں گذارنے کے بعد میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور سوچنا شروع کیا تو دل نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور تابعین جو گذر گئے، ان لوگوں سے کوئی ایسی بات چھوٹی نہیں تھی جسے ہم اب پانا چاہتے ہیں حالانکہ وہ ان چیزوں کے جاننے کی زیادہ قدرت رکھتے تھے ان امور کے زیادہ عالم تھے، ان کے حقائق سے زیادہ واقف تھے لیکن اس قسم کے مسائل کے متعلق نہ انھوں نے جھگڑے کیے

ذلك... ورأيت خوضهم في الشرائع وابواب الفقه وكلامهم فيه عليه تجالسوا واليه وبه حضوا وكانوا يعلمون الناس ويدعون الى التعليم ويرغبونهم فيه وعلى ذلك مضى الصدر الاول من السابقين وتبعهم التابعون۔

نہ مباحثے۔ وہ ان باتوں میں کبھی منہمک ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمیشہ انکے متعلق خاموشی اختیار کی۔ البتہ وہ شرائع و قوانین فقہ کے ابواب میں غور و فکر کرتے تھے، انکے متعلق باتیں کرتے تھے، باہم ان مسائل پر بیٹھ کر فکر و تامل فرماتے تھے اور ان کے متعلق لوگوں کو ابھارتے تھے، لوگوں کو ان ہی مسائل کی تعلیم دیتے تھے اور انکی طرف بلاتے تھے۔ صدر اول اسی حال میں گذرا جس میں سب سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ اور انکے تابعین گذرے ہے۔

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب کی نوجوان حساس فطرت عمر بن عبد العزیز کے اصلاحی پیغام سے متاثر ہوئی اور اتنی متاثر ہوئی کہ اب تک جو کچھ اپنے کلامی مباحث کا ذخیرہ اپنے دماغ میں جمع کیا تھا سب میں ایک دفعہ آگ لگا دی۔ فرماتے ہیں :۔

فلما ظهر لنا من امورهم هذا الذي وصفناه تركنا المنازعة والمجادلة والخوض في الكلام ورجعنا الى ما كان عليه السلف واخذنا فيما كانوا عليه وشرعنا فيما شرعوا فيه۔

جب میں نے اہل کلام کے اس حال کا اندازہ کیا جس کا میں نے ذکر کیا ہے تو یہ جھگڑے رگڑے میں نے ترک کر دیے اور کلام کے مسائل میں غور و فکر کرنے سے الگ ہو گیا اور سلف جس طریقہ پر تھے اسی کی طرف واپس ہو گیا اور اسی راہ کو اختیار کر لیا جس پر وہ تھے۔

ظاہر ہے کہ اس "انقلابی قدم" نے علم کلام کے اس عالم کو اچانک پھر ایک عامی کی حیثیت میں پہونچا دیا۔ کیونکہ اُس وقت تک انہوں نے شرعی مسائل کی طرف قطعاً توجہ نہیں فرمائی تھی بلکہ ان مسائل سے اس درجہ بے تعلق تھے کہ خود فرماتے ہیں :۔

تذاكروا يوماً الايلاء فقال لصاحب له اى شئ الايلاء فقال لا ادرى۔

لوگوں نے ‌ "ایلاء"[1] کے لفظ کا ذکر کیا۔ امام صاحب نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا یہ ایلاء کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔

[1] ایلاء طلاق کی ایک چیز ہے جس میں بیوی سے ملنے کی آدمی قسم (۷۔م) کھاتا ہے۔ تفصیلات عام فقہ کی کتابوں میں پڑھیے۔

لیکن ہمت بلند تھی - عمر اگرچہ زیادہ ہوچکی تھی مگر آپ نے اس کی پروا نہ کی اور "جہل" کا اعتراف کر کے اس زمانہ میں شرعی علوم کے مشہور امام حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ درس میں حاضر ہونے لگے اور اب اس علم کا مذاق آپ پر اتنا مستولی ہوا کہ فرماتے ہیں :-

فصحبتہ عشر سنین — میں دس سال تک ان کے ساتھ رہا -

لوگوں کا بیان ہے کہ تجربہ سے اسکے بعد بھی امام نے اپنے کو اس فن میں پختہ نہ پایا تو پھر رجوع ہو گئے جیسا کہ انھیں کا بیان ہے :-

فلم افارقہ حتے مات — پھر میں ان سے اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک ان کی وفات نہ ہوئی -

الغرض حضرت عمر بن عبد العزیز کے انقلابی عہد نے ایک طرف تو امام صاحب کو شرعی علوم کی طرف راغب کیا، اور دوسری طرف اس کا بھی میدان ان ہی کی حکومت نے تیار کر دیا تھا کہ ہر جاننے والا اپنے علم کی اشاعت کرے اور "اسلامی نظام" میں گذشتہ خلفاء بنی اُمیہ کی بدولت جو رخنے پیدا ہو گئے تھے انھیں بند کرے - واقعات و حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب پر ان دونوں تحریکوں کا کافی اثر پڑا تھا - علمی تحریک کے نتائج حاصل کرنے میں تو خدا نے انھیں پوری کامیابی عطا فرمائی - لیکن یکایک پھر زمانے نے پلٹا کھایا اور جس علم کو لے کر امام صاحب چاہتے تھے کہ اصلاح یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے میدان میں اتریں اور اپنا حوصلہ پورا کریں ، زمانے نے پھر اسکی راہوں پر کانٹے بچھا دیے - عمر بن عبد العزیز اپنی خلافت کی مختصر مدت (دو ڈھائی سال تقریباً) پوری کر کے اپنے خدا سے جا ملے — اور انکی جگہ جو شخص بنی امیہ کی گدی پر بیٹھا وہ عبد الملک کا بیٹا یزید تھا - تخت پر بیٹھتے کے ساتھ ہی اس نے جو فرمان نکالا وہ تاریخوں میں درج ہے - اس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

اما بعد فان عمر کان مغروراً غررتموہ انتم واصحابکم - فاذا اتاکم کتابی ھذا فدعوا ما کنتم تعرفون — اما بعد واضح ہو کہ عمر ابن عبد العزیز ایک فریب خوردہ شخص تھا - تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اسے خوب دھوکہ میں ڈالا - اب جوں ہی کہ میرا یہ فرمان تمہارے

من عهده - اعيدوا الناس الى طبقتهم الاولى اخصبوا ام اجدبوا احبوا ام كرهوا احيوا ام ماتوا والسلام (عقد الفرید جلد ۲)

پاس پہونچے یک لخت اُن تمام طریقوں کو ترک کر دو جو اب تک تم عمر کے عہد کی چیزوں کے متعلق جانتے تھے لوگوں کو پہلی حالت کی طرف واپس لوٹا دو، خواہ سرسبزی کا زمانہ ہو یا خشک سالی کا، لوگ اسے پسند کریں یا ناپسند کریں، جئیں یا مریں۔

اس کے بعد لوگوں کے حوصلوں پر جو اوس پڑی ہوگی اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے یزید کے بعد امام صاحب کے زمانے میں چھ خلفاء بنی اُمیہ میں ہوئے۔ لیکن ان میں زیادہ تر اسی قسم کے لوگ تھے جو بجائے عمر بن عبدالعزیز کو اسوہ بنانے کے اپنے ان آباؤ اجداد کے نمونوں پر حکومت کرتے تھے جنھوں نے نبوت کی راہ کو چھوڑ کر عجمی سلاطین کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ خود یہی یزید جو عمر بن عبدالعزیز کے بعد تخت پر بیٹھا اپنی آوارگیوں اور عیاشیوں میں اُس حد کو پہونچا ہوا تھا جس کا تذکرہ سلامہ اور حبابہ کے حسن و عشق کے قصوں میں عام طور پر مشہور ہے۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ سلامہ کی مردہ لاش تک کے ساتھ اس نے مجامعت کی۔ یہی شخص ہے جس نے مشہور ابن ہبیرہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور ابن ہبیرہ نے حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو بدسلوکیاں کیں ان کا کچھ ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ آپ کو اتنے تازیانے لگائے تھے جس سے آپ کی کھال اُدھڑ اُدھڑ جاتی تھی۔ ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے اصلاحی تحریکوں کے پھلنے پھولنے کا کیا موقعہ مل سکتا تھا بھلا جو اپنی رعایا کے ساتھ اس حد تک ظلم کرنے پر آمادہ ہو کہ "وہ مریں یا جئیں لیکن حکومت اپنے مطالبات میں سے ایک رتی برابر بھی تخفیف نہیں کر سکتی" اس سے کیا امید ہو سکتی تھی کہ وہ نظام شریعت کے احیاء میں لوگوں کی امداد کریگا؟

لیکن اخلاص کے ساتھ جس تحریک کی بنیاد ڈالی جاتی ہے قدرت اسکو بالآخر ناکام ہونے نہیں دیتی ۔ عمر بن عبدالعزیز تو ایک نرسنگھا پھونک کر چلے گئے اور انکے بعد فوراً اس آواز کو دبا دینے کی کوشش کی گئی، تاہم اس دبی ہوئی حالت میں یہ چنگاری ان دلوں میں اندر ہی اندر سلگتی رہی جنھوں نے انکے پیغام کو عزم کی طاقت کے ساتھ قبول کیا تھا۔ میرے سامنے اس وقت دوسروں کا حال نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں یہاں صرف اس نوجوان کا

حال بیان کرتا ہے جو بعد کو امت میں "الامام الاعظم ابو حنیفۃ النعمان" کے نام سے مشہور ہوا (قدس اللہ سرہ و روح روحہ)
امام صاحب میں جو علمی انقلاب پیدا ہوا تھا اس کا قصہ تو مشہور ہے۔ لیکن علم کے بعد جس چیز کا درجہ ہے یعنی عملی انقلاب اس میں امام ابو حنیفہ نے کیا کام کیا اور اتنے شدید موانع کے ہوتے ہوئے اس میں انھوں نے کس طرح کامیابی حاصل کی، اگرچہ مورخین نے ان کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن جستہ جستہ مقامات میں جو باتیں پائی جاتی ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

۳- خلافت اور پادشاہی کا فرق

امام صاحب نے اپنے عمل کا نظام نامہ کیا مرتب کیا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا صحیح علم اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ امام صاحب خود یا انکے شاگردوں کا کوئی بیان اس سلسلہ میں مجھے کسی طرح مل سکتا مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ تو بڑی بات ہے، یہاں تو ارباب تاریخ نے بھی کوئی مسلسل چیز اس ذیل میں نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن امام صاحب کا نظام نامہ اگر ہمارے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا، ان کا کام تو ہمارے سامنے ہے۔ آخر "ان" سے بھی تو بر لم الملک راہ بنائی جاتی ہے اور پھلوں سے اکثر درختوں کو پہچانا گیا ہے۔ میری کوشش کی بھی اس راہ میں یہی نوعیت ہے۔

میں نے عرض کیا تھا، امام کو اپنی جوانی کے دنوں میں روشنی کے بعد جس تاریکی سے سابقہ پڑا تھا وہ یزید بن عبد الملک کی حکومت اور اس حکومت کی بنیاد کا وہ اساسی فرمان تھا جسے عقد الفرید سے میں بجنسہ نقل کر چکا ہوں۔ اس فرمان کا وہ فقرہ یعنی اعیدوا الناس الی طبقتھم الاولی در اصل تشریح کا محتاج ہے کہ اسی کی تشریح سے امام کے ابتدائی منصوبہ (پروگرام) کا جہاں تک میرا خیال ہے کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس فقرہ کا سیدھا سادہ مطلب تو یہی ہے کہ عمر بن عبد العزیز کی حکومت سے پہلے مسلمان جس حال

میں تھے، اسی حال کی طرف وہ واپس کر دیئے جائیں۔ یہ یزید نے اپنے گورنروں کے نام حکم جاری کیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا وہ حال کیا تھا جس کی طرف وہ انھیں لوٹا کر پہونچانا چاہتا تھا؟

ممکن ہے لوگوں کو مجھ سے اختلاف ہو لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کچھ اسی زمانہ میں نہیں بلکہ تقریباً ایک حد تک ہر زمانہ میں حکومتوں کے اثر سے زیادہ تر وہی بگڑتے ہیں جو دراصل خود بگڑنا چاہتے ہوں خصوصاً مذہب کی حد تک شاید میرا یہ دعویٰ بالکلیہ غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہو، وہ خود اپنے کو اسی مذہب کا پیرو بتاتے ہوں، اور وہ مرتد و منافق نہ ہوں میرا مطلب یہ ہے کہ خلفاء بنی اُمیہ کی ذاتی زندگی مذہبی حیثیت سے جیسی کچھ ہو لیکن بایں ہمہ ان پر بہتان ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ العیاذ باللہ اسلامی عقائد کو ترک کر کے کفر کے خیالات پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے۔ کون ثابت کر سکتا ہے کہ جس حکومت کے اکثر خلفاء خود جماعت کے پابند تھے، خود امامت کراتے تھے، روزے رکھتے تھے، حج کرتے تھے، وہی مسلمانوں کو نماز روزہ حج اور زکوٰۃ سے روکنا چاہتے تھے؟ یزید بن عبد الملک اپنے فرمان سے جس سابق حال کی طرف مسلمانوں کو لوٹانا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ اسکی قطعاً یہ غرض نہ تھی کہ مسلمان بے دین بنا دیئے جائیں اور ان میں فسق و فجور پھیلایا جائے۔ کیونکہ نہ اس سے پہلے بنی اُمیہ کے خلفا نے ایسا کیا تھا، اور نہ عموماً حکومتیں اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں اتنا براہ راست دخل دیتی ہیں۔

سلاطین و امرا کے شخصی حالات سے متاثر ہو کر جو بگڑتے ہیں، زیادہ تر یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جنکی فطرت چھچوری، اور جنکا دماغ کھوکھلا ہوتا ہے۔ پھر کسی قوم کے چند افراد جب بگڑ جاتے ہیں تو ان کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی بتدریج ان ہی راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب یہ خود چلنے پر آمادہ ہوں۔ پختہ عزم اور بلند حوصلہ رکھنے والوں نے جب کبھی یہ طے کر لیا ہے کہ "دہر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہو ہونے دو لیکن ہم اس کے ساتھ نہیں گھومیں گے"، تو خواہ کسی قسم کی حکومت ہو ان کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔ خصوصاً جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی انتھک

کوششوں نے اسلامی دُنیا کے گوشہ گوشہ کو اہل علم وفضل سے بھر دیا تھا - ایک بڑا گروہ ایسے علما کا تقریباً ہر مرکزی مقام پر پیدا ہو گیا تھا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی ہی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بنائے ہوئے تھا - تاریخوں میں لکھا ہے کہ اسی بنیاد پر حضرت عمر بن عبد العزیز کو قوم کی جانب سے معلم العلماء کا خطاب دیا گیا تھا - ابن سعد نے مشہور محدث میمون بن مہران سے نقل کیا ہے -

کان عمر بن عبد العزیز معلم العلماء (۱) ج ۷ ص ۲ عمر بن عبد العزیز علما کے معلم اور استاذ تھے -

بہرحال اور کسی حکومت کے عہد میں ایسا ہو یا نہ ہو الیکن جس عہد میں حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ہوش سنبھالا تھا، اس وقت مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا مذہب ان کا دین[1] سلاطین و امرا کے دسترس سے باہر تھا، کم از کم میرا تو یہی خیال ہے - لیکن باوجود اس کے مسلمانوں کی زندگی کے دو شعبے، یعنی ان کا مال اور ان کا انصاف حکومت کے پنجوں میں پھنسا ہوا تھا اور یہ دو چیزیں ہیں بھی ایسی کہ حکومت کے سوا اسکی نگرانی کوئی دوسری طاقت کر بھی نہیں سکتی - خلافت کے نام سے حکومت کا جو نظریہ اسلام نے پیش کیا تھا منجملہ اور خصوصیات کے ان دونوں شعبوں میں اس کا جو نقطۂ نظر تھا، اور خلافت کے نظریہ کو بادشاہت اور ملوکیت کے نظریہ سے جب بدل دیا گیا تو پھر حکومتوں کا جو طرز عمل اس سلسلہ میں ہو گیا تھا، اگرچہ اجمالاً اس کا علم تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان کو ہے لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسکی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ چند جزئی مثالوں سے اُسے واضح نہ کیا جائے -

اسلامی اموال یا بیت المال کے متعلق خلافت کے نقطۂ نظر کی تعبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اُن واقعات سے ہو سکتی ہے جو تواتر کی حیثیت میں تاریخ کی اکثر کتابوں میں عموماً بکھرے ہوئے ہیں - مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوفہ کا عامل آیا - حضرت اندر تھے - عامل وہیں بلا لیا گیا - اس نے دیکھا کہ حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں - وہ سخت متعجب ہوا جب ایشیا و افریقہ کے اتنے بڑے بادشاہ کے سامنے صرف جو کی روٹیاں اور زیتون کا تیل رکھا ہوا تھا - عامل نے کہا کہ آپ کے ممالک محروسہ میں گیہوں کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے پھر حضرت

[1] مولانا نے یہاں دین کا لفظ بڑے ہی تنگ اور محدود معنوں (۵۲) میں استعمال کیا ہے - ترجمان القرآن

جَو کی روٹی کیوں تناول فرما رہے ہیں؟ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کیا گیہوں کی اتنی مقدار پیدا ہوتی ہے کہ ہر ہر مسلمان تک اسکی روٹی پہونچ جائے؟ اس نے کہا کہ اسکی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟ فاروق نے اس وقت خلافت کے نظریہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: "مسلمانوں کا امیر گیہوں کی روٹی اُس وقت تک کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر مسلمان کو جو ہمارے علاقہ میں آباد ہے گیہوں کی روٹی نہ پہونچ جائے"۔ عام رمادہ میں آپکا غلام کچھ گھی اور پنیر لے آیا۔ حضرت نے فرمایا مجھے مسلمانوں کے حال کا احساس کیسے ہو سکتا ہے جب تک کہ خود بھی وہی نہ کھاؤں جو عام مسلمان کھاتے ہیں (کامل ابن اثیر و ابن سعد وغیرہ میں اس قسم کے واقعات کا ایک ذخیرہ موجود ہے)۔

لیکن جب خلافت سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تو مسلمانوں کا وہی امیر جسکے فرائض کی ذمہ داریاں خواہ جتنی بھی اونچی ہوں لیکن مالی حقوق کے میدان میں وہ مسلمانوں کی صف کا سب سے آخری آدمی قرار دیا گیا تھا، اب بادشاہ بن کر وہ اسلامی اموال کا سب سے پہلا مطلق العنان خود مختار حق دار بن گیا۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہی گدی جس پر بیٹھنے والوں کو خلافت کے زمانہ میں اس حال میں پایا گیا تھا جیسا کہ امام مالک حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے راوی ہیں کہ:-

رأیت عمر بن الخطاب وھو یومئذ	میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا اس زمانہ میں جب کہ وہ
امیر المومنین قد رقع بین کتفیہ	مسلمانوں کے امیر تھے کہ اپنے مونڈھوں کے بیچ میں
برقع ثلاث لبد بعضھا فوق بعض	تین پیوند لگائے ہوئے ہیں، ایک کو دوسرے کے ساتھ چپکا دیا گیا تھا۔

اور یہ تو امام مالک جیسے ثقہ راوی کا بیان ہے۔ ورنہ تاریخوں میں دس دس بارہ بارہ پیوندوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان پیوندوں میں کبھی کبھی سرخ چمڑے کا ٹکڑہ بھی ہوتا تھا۔ اور جس کے تو شہ خانہ عامرہ کی یہ رپورٹ ہے کہ کبھی کبھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقت مقررہ پر گھر سے باہر نہ نکلتے، وجہ پوچھی جاتی تو اس زمانہ کی دنیا کا سب سے بڑا فرمانروا جواب دیتا:

غسلت ثیابی فلما جفت خرجت الیکم (ازالۃ الخفاء)	کپڑے دھو رہا تھا جب خشک ہوئے تو تم لوگوں کے پاس آیا ہوں

لیکن رسول کی یہی گدی مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر جب دمشق پہونچتی ہے تو اس پہ بیٹھنے والوں میں سے ایک کو گھر میں نہیں سفر میں اور وہ بھی حج کے سفر میں دیکھا گیا کہ

خرج حاجا فحمل ثیاب ظہرہ علی ستمائۃ حمل۔ (عقد الفرید ص ۳۶۶ ج ۱)

حج کے ارادہ سے نکلا اور چھ سو اونٹوں پر صرف اسکے بدن کے کپڑے تھے۔

یہ عبد الملک کا بیٹا ہشام خلفاء بنی اُمیہ کا پانچواں خلیفہ تھا۔ زمانہ کی کیسی نیرنگیاں ہیں؟ مسلمانوں کا وہی مال جسکی ذمہ داریوں کے احساس میں کبھی اتنی نزاکت ہو جاتی تھی کہ بحرین سے کچھ مشک کے نافے آتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو وزن کرانا چاہتے ہیں، آپ کی حرم محترم بی بی عاتکہ فرماتی ہیں کہ حکم ہو تو میں تول کر بتادوں، آپ چپ ہو جاتے ہیں، وہ پھر عرض کرتی ہیں، حضرت عمر نے اسکے بعد جواب میں جو کچھ فرمایا دنیا کی قوموں میں نہ پہلے اس کی نظیر تھی اور نہ آئندہ اب تک ملی ہے، بی بی صاحبہ کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوتا ہے:۔

لا احب ان تضعیہ فی الکفۃ ثم تفعلین هکذا۔

میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تم ترازو کے پلے میں مشک کو رکھو اور پھر یوں کرو (ہاتھ سے آپ نے اشارہ فرمایا)

راوی کہتے ہیں کہ حضرت کا مقصد یہ تھا کہ چھونے چھانے سے ہاتھ میں مشک کی جو خوشبو رہ جائیگی اور تم نے اپنے اوپر اسے مل لیا، تو؟

فاصیب بذالک فضلا علی المسلمین (ازالۃ الخفاء)

عام مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ حصہ ہم تک پہونچ جائے گا۔

بیت المال کا یہی مال ہے، مسلمانوں کے حقوق اس کے ساتھ اسی طرح بلا کم و کاست متعلق ہیں جس طرح پہلے تھے، اگر خلافت کے نام سے رسول کی وراثت کے مدعی بنکر جو بادشاہت کرتے تھے وہی اس مال کو خرچ کرتے ہیں اور کس پر خرچ کرتے ہیں، ابن عبد ربہ کی زبانی سنیئے عقد الفرید میں لکھتے ہیں

کتب الولید الی المدینۃ یحمل الیہ اشعبؑ فالبسہ سراویل جلد قرد لہ ذنب، وقال لہ ارقص وغنّ صوتًا ما یعجبنی فان فعلت اعطیتک الف درھم فرقص وغنّیٰ فاعجبہ فاعطاہ الف درھم۔[۱]	ولید نے مدینہ لکھا کہ اشعب (مسخرہ) کو میرے پاس بھیجدیا جائے۔ اشعب جب دمشق پہونچا تو ولید نے بندر کی کھال جس میں دُم بھی تھی اسے پہنائی اور فرمائش کی کہ کھال پہنے ہوئے تم میرے سامنے ناچو اور گاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو ہزار درہم تمہیں انعام دونگا۔ اشعب ولید کے سامنے

ناچا گایا۔ ولید کو پسند آیا اور ہزار درہم اس نے انعام میں دیئے۔

اور یہ کوئی نادر یا استثنائی واقعہ نہیں ہے بلکہ عمر بن عبد العزیز کے سوا مسلمانوں کے بیت المال کو ان خلفا میں سے اکثر نے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے رکھا تھا۔ من مانے طرز پر جس طرح جی چاہتا تھا اس میں تصرف کرتے تھے۔ کس کو دے رہے ہیں، کتنا دے رہے ہیں، کس لیے دے رہے ہیں، ان سوالات میں سے کوئی سوال ان کے سامنے نہیں تھا۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ گڑے مردوں کی ہڈیاں اکھاڑنی فطرتاً میرے لیے نہایت مکروہ شغل ہے اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ میں نے تمثیل کے لیے ایک واقعہ حضرت عمر بن عبد العزیز سے پہلے خلیفہ ولید بن عبد الملک کا درج کیا ہے۔ اور دوسری مثال کا تعلق ہشام بن عبد الملک سے ہے جو عمر بن عبد العزیز کے بعد کا خلیفہ ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ جس حال کی طرف یزید لوگوں کو واپس کرنا چاہتا تھا اس کا سب سے بڑا اہم شعبہ بیت المال ہی کا مسئلہ تھا۔ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اپنی خانگی اور ذاتی زندگی سے اسلامی بیت المال کے نقطۂ نظر کو سمجھانا چاہا اور ایسی مثالیں

---

[۱] اشعب عہد بنی امیہ کا مشہور مسخرہ تھا، لطائف و نوادر کے بیان کرنے میں طاق تھا کسی نے پوچھا میاں اشعب! کبھی کوئی حدیث بھی تم نے یاد کی بولا ہاں مجھ سے نافع نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ جس میں دو خصلتیں ہونگی وہ خدا کے یہاں خالصین مخلصین میں لکھا جائیگا، پوچھا گیا کون سی دو خصلتیں؟ بولا ایک خصلت تو نافع ہی کو یاد نہ رہی تھی اور دوسری میں بھول گیا۔ اسکے بعض عجیب نوادر "محاضرات" کی کتابوں میں منقول ہیں۔

پیش کیں جنکی نظیر خلافت راشدہ کے سوا دُنیا کی کسی حکومت میں مل نہیں سکتی۔ بلکہ ہر قسم کی قوت جو انھیں حاصل تھی انھوں نے چاہا کہ اسکے ذریعہ سے اس غیر اسلامی روح کو خلافت کے قالب سے نکال دیں۔ لیکن ان کے بعد کے خلفاء[1] میں پھر وہی خبیث روح گھس گئی۔ بنی اُمیہ کی عادت اتنی بگڑ چکی تھی کہ عمر بن عبدالعزیز نے جس وقت اعلان کیا کہ مسلمانوں کا بیت المال مسلمانوں کا ہے اور اس کی تقسیم اسی اصول پر ہوگی جس پر اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے بانٹا ہے تو ابتدا میں اچھی خاصی بے چینی امرا بنی امیہ میں پیدا ہوئی۔ لیکن جب ایک دن کڑک کر بر سر منبر انھوں نے اعلان کیا۔

ان اللہ فی بنی مروان ذبحاً وایم اللہ لئن کان ذلک الذبح علی یدی (ابن سعد)

شاید بنی مروان پر خدا کی طرف سے کوئی سخت خونریزی مقدر ہے۔ خدا کی قسم یہ خونریزی میرے ہاتھوں اگر ہوئی تو مجھے اس سے انکار نہ ہوگا۔

راوی کا بیان ہے کہ مروانی جانتے تھے کہ عمر ارادہ کا پکا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کر گذرے اس لیے۔

فلما بلغهم ذلك كفوا وكانوا يعلمون صرامته وانه ان وقع فی امر مضی فیه (ابن سعد)

جب مروانی امرا کو اس کی خبر پہونچی تو شورش سے رُک گئے کیونکہ عمر کے عزم کی پختگی سے واقف تھے جانتے تھے کہ جس بات کا ارادہ کرتا ہے کر گذرتا ہے۔

ایک دفعہ یہی امرا وفد کی صورت میں ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا یہ معروضہ پیش کیا۔

انك قصرت بنا عما كان يصنعه بنا من قبلك وعاتبوه (ابن سعد ج ۶)

تم سے پہلے جو سلوک ہم لوگوں کے ساتھ تمہارے پیش رو کرتے تھے تم نے اسے بہت گھٹا دیا ہے اس پر ان لوگوں نے حضرت عمر کو لعنت ملامت بھی کی۔

اس وفد میں مروانی خاندان کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا شریک تھا۔ اس سے بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ

[1] مولانا لفظ خلافت اور خلفاء کو اسی طرح استعمال فرما رہے ہیں جس طرح عام مسلمان مورخین استعمال کرتے ہیں۔ خلافت اور بادشاہی کے اصطلاحی فرق کو انھوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ ترجمان القرآن

بیت المال کے متعلق خلفاء نے لوگوں کو کس بات کا عادی کر دیا تھا؟ حضرت عمرؓ نے اسکے جواب میں ایک ایسی بات کا اعلان کیا کہ اسکے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے اور آخری امید جو عمر کی موت سے وابستہ تھی اس کو بھی ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا، اور پورے عزم و ارادے کے ساتھ فرمایا۔

لئن عدتم لمثل هذا المجلس لاشدن رکابی ثم لاقدمن المدینة ولاجعلنها امرا شوریٰ (ابن سعد)

اگر تم لوگوں نے پھر کبھی میرے پاس آکر ایسا کیا تو میں سوار ہو کر فوراً مدینہ چلا جاؤنگا اور حکومت کو مسلمانوں کے مشورہ کے سپرد کر دونگا۔

جسکے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت اور ان کے بیت المال کو تمہارے خاندان سے ہٹا کر پھر مسلمانوں ہی کے حوالہ کر دونگا۔ ظاہر ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو عمر کے بعد اپنی خلافت و بادشاہت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں سارا خواب، خواب پریشان ہو کر نہ رہ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکے بعد پھر اس قسم کی آواز ان لوگوں کی طرف سے نہیں اٹھی۔

اور یہ تو بیت المال کے مصارف کا حال تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد مداخل میں بھی جو بے اعتنائیاں برتی جاتی تھیں، انکی داستان طویل ہے۔ بس وہی مشہور تاریخی واقعہ اسکا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جب مصر کے قبطیوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا اور اسکی وجہ سے جزیہ کی آمدنی کم ہونے لگی تو اموی خلیفہ نے گورنر مصر کے نام حکم بھیجا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہی نے اپنے فرمان سے اسکا انسداد نہ فرمایا۔ شریح بن حیان مصر کے گورنر تھے انھوں نے حسب دستور قدیم بارگاہ خلافت میں اطلاع بھیجی کہ

ان اهل الذمة قد اسرعوا فی الاسلام وکسروا الجزیة

ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہے جس سے جزیہ کی آمدنی میں ٹوٹا آ رہا ہے۔

لیکن اب تخت خلافت پر ولید یا عبدالملک نہیں تھا بلکہ عمر فاروق کا نواسہ تھا۔ جواب میں ارقام فرمایا

اما بعد فان الله بعث محمداً صلی الله علیہ وسلم داعیاً ولم یبعثہ جابیاً فاذا اتاک کتابی ھذا فان کان اھل الذمۃ اسرعوا فی الاسلام وکسروا الجزیۃ فاطو کتابک واقبل۔ (ابن سعد ج ۵، ص ۲۸۳)

اما بعد معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی اور خدا کی طرف بلانے والا بنا کر مبعوث کیا تھا۔ حضور کو خدا نے محصول (ٹیکس) وصول کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے اور ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہو جسکی وجہ سے جزیہ کی آمدنی ختم ہو رہی ہو، تو اپنے حساب کتاب کے رجسٹر کو لپیٹ کر فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

انھوں نے صرف یہ ہی نہیں کیا، بلکہ تمام صوبوں کے عمال وولاۃ کے نام احکام جاری کیے کہ

ان یدعوا اھل الجزیۃ الی الاسلام

جزیہ دینے والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے۔

مروانی حکومتوں کے بگاڑے ہوئے ایک خراسانی امیر نے اس پر عرض کیا کہ دل سے یہ لوگ اسلام نہیں لاتے اس لیے مناسب ہے کہ ختنہ کرانا بھی ان کے لیے آپ ضروری قرار دیجیے۔ اس نے سمجھا تھا کہ شاید اس تدبیر سے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ لیکن حضرت نے جواب میں فرمایا

(فارد ھم عن الاسلام بالختان؟

کیا ختنہ کی وجہ سے میں ان لوگوں کو اسلام سے روکدوں؟

اس کے بعد جو بات آپ نے فرمائی، اُن تشدد پسند مولویوں کے لیے اسمیں عبرت ہے جو مچھروں کے بچانے کیلیے اونٹوں کو قربان کر دینے کے عادی ہیں، اور جو ایسا نہیں کرتا اس پر مداہنت کا الزام لگاتے ہیں۔ عمر بن عبد العزیز سے زیادہ اسلامی تاریخ میں صحابہ کے بعد متصلب فی الدین ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ لیکن وہی کہتے ہیں اور ختنہ جیسی موکدہ سنت بلکہ شعاری سنت کے متعلق فرماتے ہیں۔

ھم لو قد اسلموا فحسن اسلامھم کانوا الی الطھرۃ اسرع (ابن سعد)

جب وہ اسلام لے آئینگے اور انکا اسلام خوب اچھی طرح انکے دلوں میں جم جائیگا تو ختنہ کی طرف خود دوڑینگے۔

راوی کہتا ہے کہ اس نرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک اس علاقہ میں

اسلم علی یدہ اربعۃ آلاف — انکے ہاتھ پر چار ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مصارف کے ساتھ مداخل میں بھی اسلامی حدود کی پرواہ نہ کی جاتی تھی، اور اس سلسلہ میں یہاں تک غلو بڑھ گیا تھا کہ مالی ترقیوں کی ہوس میں اسلام کے تنزل تک کو گوارا کر لیا جاتا تھا۔

بیچارے حضرت عمر بن عبد العزیز نے مداخل کی اصلاح کی بھی پوری کوشش کی۔ لیکن اس اصلاحی تحریک کی وجہ سے خزانہ کو جو تاوان برداشت کرنا پڑتا تھا، ہر شخص کے قلب میں اسکی قوت کہاں تھی جو عمر بن عبد العزیز کی طرح تاوان کی شکایت کو سن کر یہ فرماتا، جیسا کہ میمون بن مہران سے روایت ہے کہ کسی علاقہ کا عامل حاضر ہوا آپ نے محصولات کی آمدنی کا حال پوچھا، اس نے جمع بتائی تو گزشتہ خلفاء کے زمانہ سے وہ بہت کم نکلی، حضرت نے وجہ پوچھی، عامل نے کہا کہ فلاں فلاں مدوں کی آمدنیوں کو آپ نے رد کر دیا یہ اسی کا نتیجہ ہے، جواب میں ارشاد ہوا۔

ما الغیتہ ولکن اللہ الغاہ (ابن سعد) — یعنی ان محصولوں کو ساقط نہیں کیا ہے۔ انکا ساقط کرنیوالا تو خدا ہے۔

بیت المال کی جو حالت ان خلفاء کے زمانہ میں ہو گئی تھی اس کے اندازہ کے لیے غالباً میرا اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔

اب میں دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، یعنی مسلمانوں کا جو "انصاف" ان خلفاء کے ہاتھ میں تھا اس پر کیا گذر رہی تھی۔

کس قدر افسوس کی بات تھی کہ وہی "عدل" جسکے متعلق قرآن نے کفر و اسلام کی تمیز باقی نہیں رکھی ہے، اور جن قوموں سے مسلمانوں کو عداوت و بغض کا تعلق ہو قرآن نے ان کے ساتھ بھی انصاف ہی کرنے کا حکم دیا ہے، اللہ اکبر جس شریعت کے شارع (علیہ السلام) نے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کیا ہو،

ولو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔ (اعاذھا اللہ منہ) — فاطمہ بنت محمد (اعاذہا اللہ تعالیٰ) بھی اگر چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دونگا۔

اور جہاں جبلہ بن ایہم جیسے بادشاہ کی شاہی قوت کو ایک معمولی غریب بدو کے انصاف پر ہمیشہ کے لیے قربان کر دیا گیا ہو، ایک بے جان بُت کی آنکھ کے بدلہ میں زندہ مسلمان سپاہی کی آنکھ صرف اس لیے کہ انصاف قایم ہو، قانون کا احترام باقی رہے، ایک کافر کے حوالہ بخوشی کر دی جاتی ہو[1] مگر جب خلافت نے سلطنت کا چولا بدلا، اس وقت کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا؟ ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے صرف یہی نہیں کہ قانون کے نافذ کرنے میں قریب و بعید دوست و دشمن کا فرق کیا جاتا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کی اپنے مطلب کے مطابق تشریح کا حق بھی "ان بادشاہ غلیعوں" اور ان کے ولاۃ و حکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جب مدینہ منورہ کے والی عمرو بن سعید نے عبد الملک کے حکم سے چاہا کہ مکہ معظمہ پر فوجی حملہ کیا جائے اور اس لیے وہ مدینہ ہی سے فوج بھیجنے کا سامان کر رہا تھا، تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو شریح کھڑے ہوئے بخاری میں ہے کہ انھوں نے فرمایا:۔

ایذن لی ایھا الامیر احدثك قولاً قام بہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الغد من یوم الفتح سمعتہ اذنای ووعاہ قلبی وابصرتہ عینای حین تکلم بہ۔	اے امیر مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ سے ایک ایسی بات کہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن فرمایا تھا۔ میرے دونوں کانوں نے اسے سُنا ہے اور میرے دل نے اسے یاد رکھا ہے، اور جس وقت حضور ارشاد فرما رہے تھے میری آنکھیں حضور کو دیکھ رہی تھیں۔

ابو شریح نے اپنے کلام میں اتنی قوت پہنچانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور حکم کہ "حرم مکہ میں خونریزی وغیرہ ہمیشہ کے لیے حرام کی جاتی ہے" بیان فرمایا۔ لیکن سب کچھ سننے کے بعد عمرو بن سعید

[1] یہ قصہ مصر میں پیش آیا تھا کسی مسلمان سپاہی نے ایک بُت کی آنکھ توڑ دی۔ بُت کا مالک حضرت عمرو بن عاص کے پاس دادخواہ ہوا۔ فیصلہ یہی کیا گیا کہ تم بھی سپاہی کی آنکھ توڑ دو۔ اگرچہ بُت پرست نے روپیہ لیکر خود معاف کر دیا لیکن اسلام نے تو مسلمان کی آنکھ کو کفر کے حوالہ اس لیے کر دیا کہ انصاف کیلیے تم اسکو توڑ سکتے ہو۔ خلافت راشدہ کی تاریخ کا ورق ورق ان حیرت انگیز واقعات سے معمور ہے بطور مثال کے میں نے چند مشہور باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عام ناظرین اس واقعہ کو قاضی سلیمان مرحوم کی سیرت رحمۃ للعالمین جلد سوم میں دیکھ سکتے ہیں۔

جو خود اپنے کو اسلامی قوانین کا شارح سمجھتا تھا آپ کو مجبور کر کہتا ہے ۔

انا اعلم منك يا اباشريح انها لا تعيذ	ابو شریح! میں تم سے زیادہ عالم اور ان امور کا جاننے والا ہوں
عاصيا ولا فارا بدم ۔	حرم کسی نافرمان اور خون کر کے بھاگنے والے کو پناہ نہیں دیتا ۔

بیچارے ابو شریح (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اسکے بعد یہ فرماکر چپ ہو گئے :۔

انی کنت شاهدًا وکنت غائبًا وقد امرنا	میں تو حضور کی صحبت میں موجود تھا اور تم غائب تھے۔ حضور کا چونکہ
رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يبلغ	فرمان تھا کہ ہم میں جو حاضر ہوں وہ انکو پہونچا دیں جو ہم میں غائب
شاهد نا غائبنا وقد ابلغتك فانت وشانك (مبنی)	ہوں، لہذا میں نے تم کو پہونچا دیا۔ اب تم جانو، اور تمہارا کام ۔

"قانون" اور "انصاف" کے ساتھ خلفا کا یہی طرز عمل تھا، جس کی اصلاح کا ارادہ فرماتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اعلان کیا تھا۔

لست بقاضٍ ولكني منفذٌ ولست بخير	میں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں (میرا کام بحیثیت خلیفہ
من احدٍ ولكني أثقلكم حملا واحسبه قال	ہونیکے) صرف نافذ کرا دینا ہے۔ تم میں سے کسی ایک سے میں بہتر
ولست بمبتدع ولكني متبع. ص ۲۷۱ ج ۶	نہیں ہوں لیکن میرا بازو زیادہ بوجھل ہے اور میری باز

پرس زیادہ سخت ہے۔ میں دین اور شرعی قانون میں کسی کی بیشی کتر بیونت کا حق نہیں رکھتا بلکہ قانون جس حال میں ملا ہے اس کا اتباع ہی میرا فرض ہے ۔

دراصل یہ تین منفی فقرے خلافت اسلامی کے اصول عدالت اور اموی پادشاہی کے طرز عدالت کا بنیادی فرق پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں ۔

پہلا فقرہ کہ "میں فیصلہ کرنے والا قاضی نہیں ہوں بلکہ بحیثیت خلیفہ ہونے کے میرا کام صرف نافذ کرا دینا ہے" مروانی خلفا اور ان کے ولاۃ کے اس طرز عمل کی تردید ہے کہ وہ شریعت کی تشریح اور واقعات پر اسکے انطباق کا اپنے کو مختار قرار دیے ہوئے تھے ۔

دوسرا فقرہ کہ "تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں" یہ اس غلط خیال کی تردید تھی جسکے سلاطین اور انکے حوالی موالی ہمیشہ شکار رہے ہیں - یعنی عام رعایا برایا سے وہ اپنے کو ایک الگ جنس قرار دیتے تھے اور اسی لیے چاہتے تھے کہ قانون انکے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرے جو عام لوگوں کے ساتھ کرتا ہے -

تیسرا فقرہ کہ "دین اور شریعت (قانون) میں مجھے کسی کمی بیشی یا کتر بیونت (ابتداع) کا اختیار نہیں ہے، بلکہ میرا کام صرف شریعت کے احکام کی تعمیل و اتباع ہے" یہ ان بیجا تصرفات کی طرف اشارہ تھا جو شریعت کے قوانین میں اپنے من مانے اغراض کے تحت خلفاء کر رہے تھے، اور شائد اس کا اپنے کو حقدار سمجھتے تھے - آپنے اس اعلان کے ذریعہ اس بدعت شنیعہ کی بیخکنی کرنی چاہی - اور واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ قضا کے محکمے ہر مرکزی جگہ میں ضرور قایم تھے لیکن جن لوگوں نے "حکومت" (جسکے لغوی معنے حکم اور فیصلہ کرنیکے ہیں) کا مقصد صرف ٹیکس وصول کرنا قرار دے رکھا تھا جسکی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک بلیغ تعریضی اشارہ ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ "ما بعث اللہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم جابیا" (اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو محصول وصول کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا تھا) ان لوگوں کے عہد حکومت میں بتدریج اس محکمہ کی اہمیت کم ہو جاتی چلی جارہی تھی - کہاں ایک وہ زمانہ تھا کہ قاضی کے تقرر کا اختیار براہ راست خلیفہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا، اور جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے، یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کی ایجاد تھی کہ ہر صوبہ میں مستقلاً وہ اپنی طرف سے تین نمائندوں کو بھیجتے تھے، ایک والی (وائسرائے) دوسرا قاضی، تیسرا افسر خزانہ - حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تینوں عہدہ دار کسی ایک کے ماتحت نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہر ایک براہ راست بارگاہ خلافت کے آگے ذمہ دار تھا - شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

در کوفہ و بصرہ وغیرہما من البلاد حاکمے جدا معین فرمود، و قاضی جدا و تحویلدار بیت المال علحدہ و ایں امر بیست کہ تا زمان حضرت فاروق واقع نشدہ بود -	کوفہ بصرہ اور دوسرے شہروں میں حضرت عمر حاکم اعلیٰ (گورنر) جدا، قاضی (جج) جدا، اور بیت المال کا تحویلدار جدا مقرر فرماتے تھے - اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے، جسکا ثبوت حضرت فاروق اعظم سے پہلے نہیں ملتا -

علاوہ دیگر مصالح کے ایک بڑا فائدہ شاہ صاحب کے خیال میں اس کا یہ تھا کہ

اگر بالفرض از یکے خیانتے ظاہر شود، دیگرے بانکار برخیزد، واجتماع جماعتہ مسلمین کہ مجرب بصدق باشند برخیانت بعید ست ص۲۶ ازالۃ الخفاء ج ۲

بالفرض کسی سے اگر بددیانتی سرزد ہو تو دوسرا ٹوکنے پر آمادہ ہوا، اور یہ بات کہ (تینوں کے تینوں) بددیانتی پر اتفاق کریں ایسی صورت میں کہ ان کی راستبازی کا پہلے سے تجربہ بھی کر لیا گیا ہو ذرا مشکل ہے۔

اسی نظم کا یہ نتیجہ تھا کہ کسی خاص صوبے سے نہیں بلکہ سارے اسلامی محروسہ سے ممتاز آدمیوں کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قاضیوں پر والیوں کو کسی قسم کا اقتدار چونکہ حاصل نہ تھا اس لیے بے خوف وخطر جو بات اُنکی سمجھ میں آتی تھی فیصلہ کرتے تھے۔ لیکن جوں ہی خلافت مدینہ سے منتقل ہو کر دمشق پہونچی، قضا اور فصل خصومات کی اہمیت اس درجہ گھٹا دی گئی کہ ہر صوبہ کے والی کو اس کا اختیار دیدیا گیا کہ اپنے صواب دید سے جس شخص کو وہ چاہیں اپنے علاقوں میں قاضی مقرر کریں۔

(انما کان ولاۃ البلد هم الذین یولون القضاء (حسن المحاضرہ ص۸۳)

یعنی ہر شہر کا والی خود ہی قاضی کو مقرر کر لیتا تھا۔

کیا زیادہ دن کے بعد؟ نہیں، مروان ہی کے زمانہ میں اس کا نتیجہ یہ دیکھا گیا تھا کہ جب وہ مصر دورہ پر پہونچا اور قاضی کو بلایا جس کا نام قاضی عابس تھا۔ عابس کے علم وفضل کا کیا حال تھا تاریخ والے بیان کرتے ہیں۔

کان امیاً لا یکتب۔

وہ ان پڑھ تھا، لکھنا بھی نہیں جانتا تھا۔

مروان نے اس غیر خواندہ قاضی کو مخاطب کر کے پوچھنا شروع کیا۔

مروان۔ اجمعت کتاب اللہ؟ (کیا تم نے قرآن یاد کر لیا ہے؟)

قاضی۔ لا (نہیں مجھے قرآن یاد نہیں ہے)

مروان۔ فاحکمت الفرائض؟ (تو کیا تم نے میراث کے مسائل کو پختہ کر لیا ہے؟)

قاضی - لا (ان سے بھی ناواقف ہوں)

مروان - (مروان کو اس جواب پر حیرت ہوگئی، اور بولا) فبم تقضی؟ (آخر تم کس چیز سے فیصلہ کرتے ہو؟)

بیچارے عابس اس کا کیا جواب دے سکتے تھے - الغرض بجائے خلیفہ کے قاضیوں کا تقرر والیوں کے سپرد کر دینے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے دنی اغراض کے مطابق جو آدمی ہوتا تھا اسی کا وہ تقرر کر دیا کرتے تھے - ان ہی قاضی عابس صاحب کے تقرر کی وجہ یہ لکھی ہے کہ حضرت معاویہ نے مصر کے والی مسلمہ کو لکھا کہ یزید (کربلائی) کے لیے لوگوں سے بیعت لی جائے - حسب الحکم مسلمہ نے بیعت لینی شروع کی - اور تو کسی طرف سے انکار نہیں ہوا لیکن حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاتح مصر عمرو بن عاص کے مشہور صاحبزادے ہیں اور علم و فضل اور علو سیرت میں لوگوں نے باپ پر بھی انہیں ترجیح دی ہے - انہوں نے بیعت سے انکار کیا - مسلمہ نے ان کے انکار پر اعلان کیا -

من لعبد اللہ؟ عبداللہ کو درست کرنے کے لیے کون آمادہ ہے؟

کہا جاتا ہے کہ یہی عابس بن سعید کھڑے ہوئے اور بولے میں اس کام کو انجام دیتا ہوں - عبداللہ بن عمرو اس زمانہ میں اپنے والد کے مشہور قصر واقع فسطاط میں قیام فرماتے تھے - عابس پولیس کے نوجوانوں کو لے کر پہونچا اور ان کے مکان کو گھیر لیا - کہلا بھیجا کہ بیعت یزید کے متعلق اب کیا ارادہ ہے؟ انھیں پھر بھی انکار ہی پر اصرار رہا - عابس نے اس کے بعد کیا کیا؟ مورخین لکھتے ہیں -

دعا بالنار والحطب لیحرق علیہ قصرہ (حسن المحاضرہ) اس نے آگ اور لکڑی جمع کی تاکہ ان کے قصر میں آگ لگا دے -

عبداللہ بن عمرو نے اس کے بعد اپنے کو مجبور اور معذور پایا، بیچارے گھر سے نکلے، اور جو کچھ اس جاہل نے کہنے کے لیے کہا دُہرا دیا -

ان بڑے عابس کا یہی سب سے بڑا کارنامہ تھا کہ ایک صحابی کو آگ میں جلا دینے کی دھمکی دے کر حکومت میں سرخروئی حاصل ہوئی تھی - اسی سرخروئی کا یہ صلہ ملا تھا کہ غریب مسلمانوں کی منڈیاں ماُنگی جانیں، انکے

مال وجائداد حکومت نے سب قرآن وحدیث اور فرائض سے بالکل جاہل اس شخص کے سپرد کردیئے۔ یہ تمثیل کے لیے یہ ایک جزئی واقعہ پیش کیا ہے، ورنہ قاضیوں کے تقررات میں جو بے اعتنائیاں مختلف اثرات کے تحت میں برتی جاتی تھیں، انکی داستان طویل ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے قاضی جو اپنے علم وفضل، تقویٰ و دیانت کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض کسی والی کے رحم وکرم پر جیتے تھے، خود تو جو کچھ کرتے ہونگے وہ تو ظاہر ہی ہے، اسکے سوا بھی ان والیوں کے دباؤ سے کہاں تک انکے فیصلے محفوظ رہ سکتے تھے اس کا ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے۔

شامت کا مارا بیچارہ کوئی قاضی اپنے والی کی مرضی کے خلاف اگر کچھ کر گزرتا تھا تو پھر اسکی خیر نہ تھی۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ میں قضا کا عہدہ طلحہ بن ہرم کے سپرد تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بنی امیہ کا مشہور گورنر خالد بن عبداللہ القسری[1] مدینہ کا والی تھا۔ شیبی خاندان (جو کعبہ کے کلید بردار ہیں) کے دو آدمیوں میں کسی زمین کے متعلق جھگڑا ہوا۔ قاضی صاحب نے ایک فریق کے حق میں جس کا نام اعجم تھا فیصلہ کردیا۔ لیکن دوسرا فریق خالد کا درباری تھا۔ اس نے فوراً مدینہ پہونچکر خالد سے قاضی کے خلاف حکم حاصل کرلیا۔ قاضی طلحہ کو اس پر غصہ آگیا اور چپ چاپ انھوں نے سلیمان بن عبدالملک کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ خلفاء بنی امیہ میں سلیمان کا شمار بھی مغتنم لوگوں میں ہے۔ قاضی صاحب کا خط جسے بصیغۂ راز قاضی نے اپنے لڑکے محمد بن طلحہ کے ہاتھ بھیجا تھا سلیمان کو ملا تو وہ برہم ہوا۔ اُسی وقت اس نے ایک حکم محمد بن طلحہ کو لکھوا کر دیا کہ سیدھے مدینہ جاکر خالد کے حوالہ کرو اور کہدو کہ اعجم کے معاملہ میں وہ دراندازی نہ کرے۔ محمد بن طلحہ اس خط کو لیکر جس وقت مدینہ پہونچتے ہیں اور خالد کے حوالے کرتے ہیں تو خالد بس یہ سُن کر آگ بگولہ ہوجاتا ہے اور قبل اسکے کہ سلیمان کا خط پڑھے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ محمد بن طلحہ کو سو

[1] اموی عہد کا مشہور رئیس ہے۔ اسکی ماں چونکہ نصرانیہ تھی اس لیے ابن النصرانیہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یافعی نے لکھا ہے کہ اس کے نائب طارق نے اپنے بچے کی ختنہ کی۔ خالد کے پاس ہزار غلام اور ہزار جوڑے اور خدا جانے کیا کیا ہزار بھیجے۔ بیت المال کے سلوک کا اس سے بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

کوڑے لگائے۔ محمد بن طلحہ کا اسکے بعد کیا حال ہوا۔ اسکا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ قاضی طلحہ نے اپنے بیٹے کے خون آلود لباس کو سلیمان کے پاس بھیجا۔ سلیمان بھی اس واقعہ کے بعد آپے سے باہر ہوگیا اور حکم دے چکا تھا کہ خالد کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، لیکن بعض امیروں کی سفارش سے معاملہ ٹل گیا۔[1]

اور یہ ایک معاملہ نہیں ہے۔ خلفاء بنی امیہ اور خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں ہارون الرشید تک ایسے واقعات مسلسل پیش آتے رہتے تھے۔ مثالاً میں دونوں خلافتوں کے متعلق ایک ایک واقعہ درج کرتا ہوں۔

سیوطی نے اپنی مشہور کتاب "حسن المحاضرۃ" میں قاضی خیر بن نعیم کے ذکر میں بنی امیہ کے عہد کا ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے:۔

ان رجلا من اھل الجند قذف رجلا	ایک فوجی سپاہی نے کسی آدمی کو گالیاں دیں۔ اس نے
فخاصمہ الیہ وثبت علیہ بشاھد واحد	قاضی خیر کے اجلاس میں دعویٰ دائر کردیا اور اپنے دعوے کے
فامر بحبس الجندی الی ان یثبت الرجل	ثبوت میں صرف ایک گواہ پیش کیا قاضی خیر نے سپاہی کو حوالات
شاھد آخر فارسل ابوعون عبدالملک	میں رکھنے کا حکم اسوقت تک کیلیے دیا جب تک کہ مدعی دوسرا گواہ
بن یزید فاخرج الجندی من الحبس فاعتزل	حاضر کرے۔ مصر کے گورنر ابوعون عبدالملک بن یزید نے
خیر وجلس فی بیتہ وترک الحکم فارسل الیہ	اپنا آدمی بھیج کر سپاہی کو حوالات سے نکلوادیا قاضی خیر کو جب اس
ابوعون فقال لا حتی ترد الجندی الی مکانہ	کی خبر ہوئی تو قضا سے کنارہ کش ہوکر بیٹھ گئے۔ ابوعون نے
فلم یرد وتم علی عزمہ صفحہ ۲۷۔	انکے پاس آدمی بھیجا (گویا معذرت طلب کی)۔ لیکن قاضی

صاحب نے کہلا بھیجا کہ جب تک سپاہی واپس نہ ہوگا میری واپسی بھی ناممکن ہے۔ مگر ابوعون نے سپاہی کو واپس نہ کیا۔ قاضی صاحب بھی اپنے ارادہ پر ڈٹے رہے۔

---

[1] عقد الفرید صفحہ ۲۹۰ ج ۲

دوسرے واقعہ کا ذکر طاش کبریٰ زادہ اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں مشہور قاضی حفص بن غیاث کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ہارون الرشید نے انکو بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ اتفاق سے ہارون کی مشہور چہیتی بیوی زبیدہ کے مرزبان (پٹیل یا نمبردار) کا ایک معاملہ قاضی صاحب کے پاس پیش ہوا۔ مرزبان کسی کا مدیون تھا۔ دین اس پر ثابت ہو گیا۔ قاضی صاحب نے مرزبان کے خلاف ڈگری دیدی۔ زبیدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ قاضی نے یہ جاننے کے بعد کہ مرزبان میرا آدمی تھا، پھر بھی اسکے خلاف فیصلہ کیا، آگ بگولہ ہو گئی۔ ہارون جب محل سرا آیا تو زبیدہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی:۔

والحت علی الرشید حتی عزلہ (ج ۲ ص ۱۱۹)		وہ ہارون کے سر ہو گئی کہ ایسے قاضی کو معزول کر دیا جائے۔

آخر ہارون نے قاضی حفص کو معزول کر دیا۔

ایک مرزبان پر اسلام کا اتنا بڑا عالم محض ایک عورت کی خاطر قربان کر دیا گیا۔

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ اسکو یاد رکھنا چاہیے۔ آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی ہارون الرشید ہے اور وہی اسکی قاہرہ حکومت۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے تلمیذ رشید قاضی ابو یوسف جن کا تقرر امام صاحب کی شہادت کے بعد ہارون ہی نے کیا اپنے زمانہ قضا میں ہارون کی بیوی یا حکام ہی کے خلاف نہیں، بلکہ خود ہارون کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتے ہیں، لیکن بجز خاموشی کے وہ اپنے لیے کوئی چارۂ کار نہیں پاتا۔ آخر یہ طرز عمل کیوں بدلا، اور اسکے پیچھے کس کے اخلاص و قربانی کی قوت تھی؟ افسوس مورخین نے اس پر غور نہیں کیا۔ بہرحال اتنی مدت کے بعد بکھرے ہوئے واقعات کو جمع کرنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر تو آئندہ آتا ہے۔ ابھی تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے "انصاف" کا جو حال ان خلفاء کے ہاتھوں ہو رہا تھا اسکی نوعیت کیا تھی؟

خلفاء کی ان بیجا طرفداریوں ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ امام ابو حنیفہ ہی نہیں، جن کا واقعہ مشہور ہے، اور بھی اس زمانہ کے کتنے ارباب صدق و امانت، تقویٰ و دیانت، حکومت کے شدید اصرار کے باوجود قضا سے

انکار کرتے تھے، اور اگر مارے باندھے کسی نے قبول بھی کر لیا تو ہمت کر کے وہ خلفاء سے اس کا معاہدہ لیتے تھے کہ فیصلوں میں ذاتیات کو دخل نہ دیا جائیگا۔ ان بیچاروں کی تسلّی کے لیے اقرار بھی کر لیا جاتا تھا لیکن زیادہ تر یہ وعدے "عرقوبی مواعید" بن کر شرمندۂ ایفا بہت کم ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں قاضی شریک کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ان خلفاء کے طرزِ عمل پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابو جعفر منصور عباسی نے قاضی شریک کو بلا کر قضاء کا عہدہ پیش کیا۔ پہلے تو انہوں نے مختلف حیلے بہانے کیے لیکن جب کوئی بات سنی نہ گئی تب قاضی صاحب نے منصور کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

انی احکم علی الصادر والوارد، وانا لا	میں ہر آنے جانے والے وارد وصادر پر فیصلہ کرونگا
ابالی انی احکم علی کل من کان ولا انظر الی	اور مجھے اسکی پروا نہ ہوگی کہ میں کس کے خلاف فیصلہ
القریب والبعید۔	کر رہا ہوں۔ کوئی بھی ہو۔ میں نہ (خلیفہ) کے مقربوں

کو دیکھوں گا، نہ انکو جو بارگاہ خلافت سے تعلق نہیں رکھتے۔

چند الفاظ کے تلفظ میں منصور کا کیا بگڑتا تھا، بولا:۔

احکم علی وعلی ولدی	آپ میرے اور میری اولاد کے مقابلہ میں بھی فیصلے کر سکتے ہیں۔

گویا منصور نے اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں یہ کہہ کر انتہائی انصاف پسندی کا اظہار کیا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ اسلام کے قانون عدل کے ماننے والوں کے لیے اس تصریح کی بھلا کیا ضرورت تھی تاہم منصور نے بڑی کشادہ دلی کو راہ دے کر خود اپنے کو اور اپنی اولاد کو قانون کے نیچے ڈالدینے کا اعلان کیا۔ لیکن قاضی صاحب کی اس سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ خلفاء سے بھی زیادہ خطرہ جن لوگوں سے تھا، اور زیادہ تر اس زمانہ کا "عدلیہ" ان ہی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا، کھل کر خلیفہ کے سامنے انہوں نے اس خطرہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا:۔

اکفنی حشمک۔ اپنے حاشیہ نشینوں (درباری امرا و موالی) سے میری حفاظت کیجیے۔ منصور نے

اسکے جواب میں بھی قاضی صاحب کو یہ کہتے ہوئے گویا مطمئن کر دیا کہ افعل (ہاں! میں ایسا ہی کرونگا)۔

مگر سبب کچھ ہو جانے کے بعد قاضی شریک جب اپنے عہدہ کا جائزہ لے کر اجلاس کے لیے بیٹھتے ہیں تو بدقسمتی سے سب سے پہلا مقدمہ جو ان کے آگے پیش ہوتا ہے وہ خلیفہ کی "مولاۃ" (چھوکری) کا معاملہ کسی شخص سے تھا۔ عادتیں تو عام طور پر بگڑی ہوئی تھیں۔ اجلاس میں جب فریقین حاضر ہوئے تو صرف اس لیے کہ چھوکری خلیفہ کی چھوکری تھی اپنے فریق کے برابر کھڑے ہونے میں اس نے اپنی توہین محسوس کی، اور آگے بڑھ کر قاضی صاحب کے سامنے آگئی۔ وہ مطمئن تھی کہ شاہی آدمیوں کے ساتھ عدالت میں اسی امتیاز کا رواج ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ شاہی انتساب کے جس نشہ میں وہ مخمور ہے نیا قاضی بھی خلیفہ کے معاہدہ کے نشہ سے چور ہے۔ لونڈی کے ہوش اڑ گئے جس وقت قضا کی گدی سے اس کے کان میں یہ آواز گونجی:۔

تاخری یا لخناء — اوگندی عورت پیچھے ہٹ جا۔

قاضی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ یہ اسلامی عدالت ہے جس میں حاضر ہونے والوں کو خواہ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا آدمی یعنی خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، ہر ادنیٰ معمولی رعیت کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ قاضی صاحب بیچارے جانتے تھے کہ اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا ہے لیکن خلیفہ کے عہد پر اُن کو غرہ تھا اس لیے شاہی لونڈی کی شان میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے۔ خدا جانے چھوکری کو بھی اپنے آقا کے معاہدہ کا علم تھا یا نہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتی تھی۔ خصوصاً جب کہ یہ ایک نئی بات تھی۔ خلیفہ نے دین کے جوش میں عمر کی مدت کی ایک رسم کے خلاف معاہدہ کیا تھا۔ قدرتاً اسکی خبر ہر کہ و مہ کو ہوئی چاہیے بہر حال اگر وہ یہ جانتی بھی تھی تو اسی کے ساتھ ان معاہدوں کا جو وزن تھا اس سے بھی ناواقف نہ تھی۔ ایک کنیز دارالخلافہ کے سب سے بڑے قاضی کو مخاطب کر کے اس فقرہ کا جو جواب دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نقل کرتے ہوئے بھی قلم کانپتا ہے۔ چھوٹتے ہی چھوکری نے بوڑھے قاضی کو کہا:۔

انك شیخ احمق — بڈھے تو احمق ہے۔

ایک چھوکری کی زبان سے اسلام کا ایک مشہور عالم یہ جملہ سنتا ہے اور دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے۔

اپنے کیے پر پچھتاتا ہے اور کہتا ہے :-

انی قلت کذالک فلم یقبل مولاک۔ میں نے خلیفہ سے اپنے متعلق یہی کہا تھا (یعنی کہ میں احمق ہوں) لیکن تیرے آقا نے قبول نہیں کیا۔

خیر یہ تو قاضی صاحب نے جواب دیا۔ لیکن شاہی عدالت کی اس صریح اہانت پر منصور نے عام عدالتی رسم کی بنیاد پر نہیں، اسلامی عدالت کے اصول پر نہیں، کم از کم اپنے معاہدہ کی لاج ہی کے لیے اس چھوکری سے کوئی جواب طلب کیا؟ کس قدر عجیب ہے کہ احکم علی و علی ولدی کا برسر دربار معاہدہ کرنے والا منصور اپنے متعلق یا اپنی اولاد کے متعلق پاس عہد و زبان تو کیا کرتا اپنی ایک چھوکری کے متعلق بھی قاضی صاحب کے اس برتاؤ کو برداشت نہ کر سکا، اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے فعزلوہ (قاضی شریک کو لوگوں نے معزول کر دیا)۔

اگرچہ منصور کے بعد مہدی کے اصرار سے قاضی صاحب کو پھر یہ عہدہ قبول کرنا ہی پڑا جس کا ذکر اپنے موقعہ پر انشاء اللہ تعالیٰ آگے آئیگا۔ لیکن منصور کے زمانہ میں تو اس نوکری کا انجام یہ ہوا۔[۱] ان ہی باتوں کا یہ اثر تھا کہ جو لوگ اپنے دین و علم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے وہ ان خلفاء کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ابن خلکان میں ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی نے حضرت سفیان ثوری کو گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلایا اور وہی قضاء کا عہدہ پیش کیا۔ ان کو انکار پر اصرار تھا لیکن وہ قبول کرا لینے پر مصر تھا۔ اس وقت مہدی اور سفیان ثوری میں ایک سخت گفتگو بھی ہوئی جس کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئیگا اور اسی وقت یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب ان خلفاء کو اپنے ڈھب کے

---

[۱] میں نے یہ سارے واقعات صدر الائمہ موفق بن احمد اور حافظ الدین البزاز الکروری سے لیے ہیں دونوں کتابوں میں واقعہ کے مختلف اجزاء مختلف مقامات میں درج ہیں۔

آدمی بکثرت مل رہے تھے تو پھر ان بیچاروں کو پکڑ پکڑ کر وہ کیوں مجبور کرتے تھے۔ بہر حال حضرت سفیان نے نہ قبول کرنے کی وجوہ میں خلفاء اور ان کے امراء حوالی موالی کی غلط دخل اندازیوں کا ذکر کیا تو اس نے اپنے باپ منصور کی طرح زبانی نہیں بلکہ تحریری معاہدہ لکھ کر حضرت کے حوالہ کرنیکا حکم دیا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ مہدی نے اپنے میر منشی کو کہا:۔

اکتبوا عہدہ علی قضاء الکوفۃ علی ان لا یعترض علیہ فی حکمہ — کوفہ کی قضاءت کا فرمان اس شرط کے ساتھ لکھ کر انہیں دیدو کہ کوئی ان کے فیصلوں میں دراندازی نہ کریگا۔

معاہدہ لکھ کر حضرت سفیان ثوری کے حوالہ کیا گیا۔ لیکن جس آسمان کے نیچے اور جس زمین کے اوپر آدم کی وہ اولاد تھی جنہیں تم اس زمانہ کے خلفاء اور امراء کے لباس میں دیکھ رہے ہو، اہیں زندگی کی تمام ضروریات رکھنے والی وہ ہستیاں بھی تھیں کہ ایک صوبہ کی ہائی کورٹ کی ججی دی جاتی ہے، لیکن اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ قاضی ابن خلکان راوی ہیں:۔

فاخذہ وخرج فرمی بہ فی دجلۃ وھرب ص ۲۱ ج ا — حضرت سفیان نے فرمان لے لیا، اور دربار سے باہر نکل کر انھوں نے اُسے دجلہ میں پھینکا اور غائب ہو گئے۔

(باقی)

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

(۳)

(بسلسلۂ اشاعت ذی القعدہ ۸ھ)

پچھلی دو اشاعتوں میں نماز کے مقاصد اور اس کے اثرات کی جو تحقیق کی گئی ہے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسکو اسلام کا رکن اعظم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ رکن ستون کو کہتے ہیں جسکے سہارے پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لیے جن سہاروں کی ضرورت ہے، ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بحیثیت مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دنیا میں خلافت الٰہی کا بار سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے ہوں۔ وہ اللہ کو اپنا واحد فرمانروا تسلیم کریں اور اسکے فرض شناس و اطاعت کیش بندے ہوں۔ اسلام کا نظام فکر و نظریۂ حیات انکی رگ رگ میں ایسا پیوست ہو جائے کہ اسی کی بنیاد پر ان میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق اُن سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہو گئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہل ایمان سے الگ ممتاز ہو جائے۔ انکی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو اور ایک مشین کی طرح پیہم متحرک رہے۔ ان میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہو۔ ان کے درمیان محبت ہو، ہمدردی ہو، تعاون ہو، مساوات ہو، وحدتِ روح اور وحدتِ عمل ہو، وہ قیادت اور

اقتدار کے حدود کو جانتے اور سمجھتے ہوں، اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ تمام مقاصد چونکہ نماز کی اقامت سے حاصل ہوتے ہیں لہذا اسکو دین اسلام کا ستون قرار دیا گیا۔ یہ ستون اگر منہدم ہو جائے تو مسلمانوں کی انفرادی سیرت اور اجتماعی ہیئت دونوں مسخ ہو کر رہ جائیں اور وہ اس مقصدِ عظیم کے لیے کام کرنے کے اہل ہی نہ رہیں جسکی خاطر اسلامی جماعت وجود میں آئی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ نماز عماد الدین ہے، یعنی دین کا سہارا ہے، جس نے اسے گرایا اس نے دین کو گرا دیا۔

۲- روزہ

ان مقاصد کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے صرف نماز کو کافی نہ سمجھا گیا بلکہ اس رکن کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ایک دوسرے رکن، روزہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ نماز کی طرح یہ روزہ بھی قدیم ترین زمانہ سے اسلام کا رکن رہا ہے۔ اگرچہ تفصیلی احکام کے لحاظ سے اسکی شکلیں مختلف رہی ہیں مگر جہاں تک نفس روزہ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ الٰہی شریعتوں کا جزو لاینفک ہی رہا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کے مذہب میں یہ فرض کی حیثیت سے شامل تھا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ اس سے یہ بات خود بخود مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کی فطرت کے ساتھ اس طریق تربیت کو ضرور کوئی خاص مناسبت ہے۔

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکن صلوٰۃ کا ہے اور اسے رکن صلوٰۃ کے ساتھ مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے۔ اس کا کام اُنہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی مترتب ہوتے ہیں۔ نماز روزمرّہ کا معمولی نظام تربیت ہے جو ہر روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم و تربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دیکر چھوڑ دیتا ہے۔ اور روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا غیر معمولی نظام تربیت (Special training course) ہے جو آدمی کو تقریباً

۷۲۰ گھنٹہ تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجہ میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے وہ شدید ہو جائیں۔ یہ غیر معمولی نظام تربیت کس طرح اپنا کام کرتا ہے، اور کس کس ڈھنگ سے نفس انسانی پر مطلوب اثرات ڈالتا ہے، اس کا تفصیلی جائزہ ہم ان صفحات میں لینا چاہتے ہیں۔

روزے کے اثرات روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب میں طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکایک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ اس دوران میں ایک قطرۂ آب اور خوراک کا ایک ریزہ تک قصداً حلق سے اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی اور زوجین کے لیے ایک دوسرے سے قضاء شہوت کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ پھر شام کو ایک خاص وقت آتے ہی اچانک حرمت کا بند توڑ دیا جاتا ہے۔ وہ سب چیزیں جو ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں یکایک حلال ہو جاتی ہیں اور رات بھر حلال رہتی ہیں، یہاں تک کہ دوسرے روزے کی مقرر ساعت آتے ہی پھر حرمت کا قفل لگ جاتا ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اسکی تکرار جاری رہتی ہے۔ گویا پورے تیس دن آدمی ایک شدید ڈسپلن کے تحت رکھا جاتا ہے۔ مقرر وقت تک سحری کرے، مقرر وقت پر افطار کرے، جب تک اجازت ہے اپنی خواہشات نفس پوری کرتا رہے اور جب اجازت سلب کر لی جائے تو ہر اس چیز سے رک جائے جس سے منع کیا گیا ہے۔

احساس بندگی اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے نظر میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقہ سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، اور اس شعور کو اتنا طاقت ور بنا دینا چاہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی و خود مختاری کو اللہ کے آگے بالفعل تسلیم (Surrender) کر دے۔ یہ اعتراف تسلیم ہی دراصل اسلام کی جان ہے، اور اسی پر آدمی کے

مسلم ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے۔ دین اسلام کا مطالبہ انسان سے صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ بس خداوند عالم کے وجود کو مان لے، یا محض ایک مابعد الطبیعی نظریہ کی حیثیت سے اس بات کا اعتراف کرے کہ اس کائنات کے نظام کو بنانے اور چلانے والا صرف اللہ واحد قہار ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اس امر واقعی کو ماننے کے ساتھ ہی اس کے منطقی اور فطری نتیجہ کو بھی قبول کرے۔ یعنی جب وہ یہ مانتا ہے کہ اس کا اور تمام دنیا کا خالق، پروردگار، قیام بخش اور مدبر امر صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ نہ تخلیق میں کوئی اللہ کا شریک ہے، نہ پرورش میں، نہ قیام بخشی میں اور نہ تدبیر امر میں، تو اس تسلیم و اعتراف کے ساتھ ہی اسے اللہ کی حاکمیت و فرمانروائی کے آگے سپر ڈال دینی چاہیے، اپنی آزادی و خود مختاری کے غلط ادعا سے خیال اور عمل دونوں میں دست بردار ہو جانا چاہیے، اور اللہ کے مقابلہ میں وہی رویہ اختیار کر لینا چاہیے جو ایک بندے کا اپنے مالک کے مقابلہ میں ہونا لازم ہے۔ یہی چیز دراصل کفر اور اسلام کے درمیان فارق ہے۔ کفر کی حالت اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے مقابلہ میں خود مختار اور غیر جواب دہ سمجھے اور یہی سمجھ کر اپنے لیے زندگی کا راستہ اختیار کرے۔ اور اسلام کی حالت اس کے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھے اور اسی احساس بندگی و ذمہ داری کیساتھ دنیا میں زندگی بسر کرے۔ پس حالت کفر سے نکل کر حالت اسلام میں آنے کیلیے جسطرح اللہ کی حاکمیت کا سچا اور قلبی اقرار ضروری ہے اُسی طرح حالت اسلام میں رہنے کیلیے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں بندگی کا احساس و شعور ہر دم تازہ ہر وقت زندہ اور ہر آن کارفرما رہے۔ کیونکہ اس احساس و شعور کے دل سے دور ہوتے ہی خود مختاری و غیر ذمہ داری کا رویہ عود کر آتا ہے اور کفر کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جس میں آدمی یہ سمجھتے ہوئے کام کرتا ہے کہ نہ اللہ اس کا حاکم ہے اور نہ اسے اللہ کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، نماز کا اولین مقصد انسان کے اندر "اسلام" کی اسی حالت کو پے در پے تازہ کرتے رہنا ہے، اور یہی روزے کا مقصد بھی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ نماز روزانہ

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اس کو تازہ کرتی ہے، اور رمضان کے روزے سال بھر میں ایک مرتبہ پورے ۳۰، ۳۰ گھنٹوں تک پیہم اس حالت کو آدمی پر طاری رکھتے ہیں تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ دل و دماغ میں بیٹھ جائے اور سال کے باقی گیارہ مہینوں تک اس کے اثرات قائم رہیں۔ اول تو روزے کے سخت ضابطہ کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اللہ کو اپنا حاکم اعلیٰ نہ سمجھتا ہو اور اسکے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار نہ ہوچکا ہو۔ پھر جب وہ دن کے وقت مسلسل بارہ بارہ تیرہ تیرہ گھنٹے کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رکا رہتا ہے، اور جب سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نفس کے مطالبات سے یکایک ہاتھ کھینچ لیتا ہے، اور جب افطار کا وقت آتے ہی نفس کے مطلوبات کی طرف اس طرح لپکتا ہے کہ گویا فی الواقع اس کے ہاتھوں اور اسکے منہ اور حلق پر کسی اور کی حکومت ہے جسکے بند کرنے سے وہ بند ہوتے اور جسکے کھولنے سے وہ کھلتے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دوران میں اللہ کی حاکمیت اور اپنی بندگی کا احساس اس پر ہر وقت طاری رہا ہے، اس پورے ایک مہینہ کی طویل مدت میں یہ احساس اسکے شعور یا تحت الشعور سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا، کیونکہ اگر غائب ہوجاتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ضابطہ کو توڑنے سے باز رہ جاتا۔

اطاعت امر احساس بندگی کے ساتھ خود بخود جو چیز لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

ان دونوں چیزوں میں ایسا فطری اور منطقی تعلق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے، نہ ان کے درمیان کبھی تناقض (Inconsistency) کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ اسلیے کہ اطاعت دراصل نتیجہ ہی اعترافِ خداوندی کا ہے۔ آپ کسی کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس کی خداوندی[۱] نہ مان لیں، اور جب حقیقت میں کسی کی خداوندی آپ مان

[۱] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ناظرین چند اصطلاحات (۲۶) کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ فارسی زبان میں لفظ خدا اور (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۴ پر دیکھیے)

چکے ہوں تو اسکی بندگی و اطاعت سے کسی طرح باز بھی نہیں رہ سکتے۔ انسان نہ اتنا احمق ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا حکم مانتا چلا جائے درانحالیکہ وہ اسکے حق حکمرانی کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور نہ انسان میں اتنی جرأت موجود ہے کہ جس کو فی الواقع وہ اپنے قلب و روح میں حاکم ذی اقتدار سمجھتا ہو اور جسے نافع و ضار اور پروردگار مانتا ہو اسکی اطاعت سے منہ موڑ جائے پس درحقیقت خداوندی کے اعتراف اور بندگی و اطاعت کے عمل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے اور یہ عین عقل اور منطق کا تقاضہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہر پہلو سے کامل توافق ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) خداوند کے وہی معنی ہیں جو عربی میں الٰہ اور رب کے معنی ہیں۔ انگریزی میں چھوٹے حرف کے ساتھ (god.) کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ ہندی میں دیو یا دیوتا کے الفاظ بھی اسی کے قریب المعنیٰ ہیں۔ ان تمام الفاظ کا استعمال دنیا کی مختلف قومیں ایسی ہستیوں کے متعلق کرتی رہی ہیں جنکے ہاتھ میں انسان کو نفع اور نقصان پہنچانے کے اختیارات ہوں، جن کا حکم اس کائنات کے نظام میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر چلتا ہو، جنکی بندگی بجالانے پر ہی انسان کی فلاح و کامرانی موقوف ہو۔ جاہل قوموں کا ہمیشہ یہ گمان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ایسی ہستیاں بہت بلکہ بے شمار ہیں۔ اور ان میں صرف غیر انسانی وجود مثلاً فرشتے اور جن ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بعض انسان مثلاً بادشاہ اولیاء اور غیر معمولی کمالات دکھانے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ اسی لیے قریب قریب سب زبانوں میں ان الفاظ کی جمع آتی ہے۔ چنانچہ عربی میں آلہہ اور ارباب، فارسی میں خدائیگاں اور خداوندان، انگریزی میں (gods) اور ہندی میں دیویوں اور دیوتاؤں کے الفاظ جمع کے ساتھ آتے ہیں۔ مگر ان سب سے اوپر ایک ایسی ہستی کا تصور بھی تمام قوموں میں رہا ہے جو ساری کائنات کی خالق ہے اور جو سب سے بالاتر ہے۔ عربی میں اللہ، فارسی میں خدائے خدائیگاں، انگریزی میں بڑے حرف کے ساتھ (God.) اور ہندی میں مہادیو اسی ہستی کے نام ہیں اور اس کے نام کی جمع کسی زبان میں نہیں آتی۔ اسلام جس چیز کی دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جن اختیارات و اقتدارات کے لیے تم الٰہ اور خداوند وغیرہ الفاظ بولتے ہو وہ تنہا اسی ایک ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ ساری کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ تمہارا نفع اور نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور جن جن کو تم اس سلطنت میں ذی اقتدار سمجھ کر خدا اور خداوند اور دیوتا مانتے ہو وہ سب تمہاری ہی طرح اس کے بندے ہیں، حقیقی اقتدار میں ان کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں۔ لہذا الٰہ اور رب اور خداوند اور گاڈ اور دیو بہت سے نہیں بلکہ صرف وہی ایک ہے جس کو تم اللہ اور دوسرے ہم معنی الفاظ سے یاد کرتے ہو۔ اس تعلیم کے لحاظ سے اصطلاحات میں جو فرق واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلم کے لیے تو وہی پچھلی اصطلاحیں برقرار رہینگی اور وہ چھوٹے خداؤں اور بڑے خدا کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کریگا، مگر مسلمان کے لیے الٰہ اور رب وہی ہوگا جو اللہ ہے، گاڈ صرف بڑے حرف کے ساتھ باقی رہیگا اور چھوٹے حرف سے اس کا استعمال نہ ہوگا، دیو اور دیوتا کے الفاظ مہادیو میں ضم ہو جائینگے، خدا اور خداوند کے الفاظ صرف خداوند عالم کے ساتھ خاص ہو جائینگے اور ان میں سے کسی لفظ کی جمع استعمال نہ کی جائیگی۔

آقائی و خداوندی میں توحید لامحالہ بندگی و اطاعت میں توحید پر منتج ہوگی، اور آقائی و خداوندی میں شرک کا نتیجہ لازماً بندگی و اطاعت میں شرک ہوگا۔ آپ ایک کو خداوند سمجھینگے تو ایک ہی کی بندگی بھی کرینگے۔ دس کی خداوندی تسلیم کرینگے تو بندگی و اطاعت کا رخ بھی ان دسوں کی طرف پھر جائیگا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ خداوندی تو ایک کی مان رہے ہوں اور بندگی دس کی بجا لائیں، یا خداوندی دس کی تسلیم کر رہے ہوں اور اطاعت ایک کی کریں۔

ذات خداوند کا تعین لامحالہ سمتِ بندگی کے تعین پر منتج ہوگا۔ آپ جسکی خداوندی کا اعتراف کرینگے لازماً اطاعت بھی اسی کی کرینگے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوند ایک کو مانیں اور اطاعت دوسرے کی کریں۔ تعارض کا امکان زبانی اعتراف اور واقعی بندگی میں تو ضرور ممکن ہے، مگر قلب و روح کے حقیقی احساس و شعور اور جوارح کے عمل میں ہرگز ممکن نہیں کوئی عقل اس چیز کا تصور نہیں کر سکتی کہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہے ہیں اسکے بجائے آپ کی بندگی کا رخ کسی ایسی ہستی کی طرف پھر سکتا ہے جس کا بندہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوں۔ بخلاف اسکے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جسکی طرف بھی آپ کی بندگی کا رخ پھر رہا ہے اسی کی خداوندی کا نقش دراصل آپ کے ذہن پر مرتسم ہے خواہ زبان سے آپ اسکے سوا کسی اور کی خداوندی کا اظہار کر رہے ہوں۔

خداوندی کے اعتراف اور بندگی کے احساس میں کمی وبیشی لازماً اطاعت امر کی کمی وبیشی پر منتج ہوگی۔ کسی کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کا احساس آپ کے دل میں جتنا زیادہ شدید ہوگا اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اسکی اطاعت کرینگے، اور اس احساس میں جتنی کمزوری ہوگی اتنی ہی اطاعت میں کمی واقع ہو جائیگی، حتیٰ کہ اگر یہ احساس بالکل نہ ہو تو اطاعت بھی بالکل نہ ہوگی۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مدعا اللہ کی خداوندی کا اقرار کرانے اور اسکے سوا ہر ایک کی خداوندی کا انکار کرا دینے سے اسکے سوا کچھ

نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرے۔ جب وہ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ [1] الْخَالِصُ کہتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت خالصاً و مخلصاً صرف اللہ کے لیے ہے، کسی دوسری مستقل بالذات اطاعت کی آمیزش اس کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جب وہ کہتا ہے کہ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے پر انسان مامور ہے، اور اسکی بندگی کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اسکی اطاعت کے ساتھ کسی دوسرے کی اطاعت مخلوط نہ کرے۔ جب وہ کہتا ہے کہ قَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی اطاعت پوری کی پوری اللہ ہی کے لیے وقف ہے اور ہر اُس طاقت سے مسلمان کی جنگ ہے جو اس اطاعت میں حصہ بٹانا چاہتی ہو، جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مسلمان خدا اور خدا کے ساتھ ساتھ اسکی اطاعت بھی کرے یا خدا وند عالم کے بجائے صرف اسی کی اطاعت کرے۔ پھر جب وہ یہ کہتا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ، تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو، اطاعت اور بندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور سارے پہلوؤں کے ساتھ اطاعت الٰہی کے نیچے آجائے، جسکی فرمانبرداری بھی ہو خداوند عالم کی اجازت کے تحت ہو اور جس فرمانبرداری کے لیے وہاں سے حکم یا سند جواز نہ ملے اسکا بندکاٹ ڈالا جائے، یہ اُس دین حق اور اس ہدایت کا تقاضا ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ بھیجا ہے۔ اس تقاضے کے مطابق خواہ انسان کے ماں باپ ہوں، خواہ خاندان یا سوسائٹی ہو، خواہ قوم اور حکومت ہو، خواہ امیر یا لیڈر ہو، خواہ علماء اور مشائخ ہوں، خواہ وہ شخص یا ادارہ ہو جسکی انسان ملازمت کر کے پیٹ پالتا ہے، اور خواہ انسان کا اپنا نفس اور اسکی

[1] لفظ "دین" کے اصلی معنی اطاعت کے ہیں۔ اور مذہب و ملت کے لیے اس لفظ کا استعمال مجازاً اس بنا پر ہوتا ہے کہ مذہب و ملت دراصل ایک نظام اطاعت کا نام ہے جس کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد آدمی ایک قانون اور ضابطہ کی فرمانبرداری اختیار کر لیتا ہے۔

خواہشات ہوں، کسی کی اطاعت بھی خداوند عالم کی اصلی اور بنیادی اطاعت کی قید سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ جو اسکی خداوندی کا اقرار کرچکا اور جس نے اسکے لیے اپنی بندگی کو خالص کرلیا، وہ جس کی اطاعت بھی کریگا اللہ کی اطاعت کے ماتحت رہ کر کریگا۔ جس حد تک جسکی بات ماننے کی وہاں سے اجازت ہوگی اسی حد تک مانے گا اور جہاں اجازت کی حد ختم ہوجائیگی وہاں وہ ہر ایک کا باغی اور صرف اللہ کا فرمانبردار نکلے گا۔

روزے کا مقصد آدمی کو اسی اطاعت کی تربیت دینا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک روزانہ کئی کئی گھنٹے آدمی کو اس حالت میں رکھتا ہے کہ اپنی بالکل ابتدائی (Elementary) ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی اس کو خداوند عالم کے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ غذا کا ایک بھورا اور پانی کا ایک قطرہ تک وہ حلق سے گذار نہیں سکتا جب تک کہ وہاں سے اجازت نہ ملے۔ ایک ایک چیز کے استعمال کے لیے وہ شریعت خداوندی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کچھ وہاں حلال ہے وہ اسکے لیے حلال ہے خواہ تمام دنیا اسے حرام کرنے پر متفق ہوجائے، اور جو کچھ وہاں حرام ہے وہ اسکے لیے حرام ہے خواہ ساری دنیا مل کر اسے حلال کردے۔ اس حالت میں خدائے واحد کے سوا کسی کا اذن اسکے لیے اذن نہیں، کسی کا حکم اسکے لیے حکم نہیں، اور کسی کی نہی اسکے لیے نہی نہیں۔ خود اپنے نفس کی خواہش سے لیکر دنیا کے ہر انسان اور ہر ادارے تک کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جسکے حکم سے مسلمان رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہو یا توڑ سکتا ہو۔ اس معاملہ میں نہ بیٹے پر باپ کی اطاعت ہے، نہ بیوی پر شوہر کی، نہ ملازم پر آقا کی، نہ رعیت پر حکومت کی، نہ پیرو پر لیڈر یا امام کی، نہ مرید پر پیر کی۔ بالفاظ دیگر اللہ کی بڑی اور اصلی اطاعت تمام اطاعتوں کو کھا جاتی ہے اور ۷۲۰ گھنٹے کی اس طویل مشق و تمرین سے روزہ دار کے دل پر کالنقش فی الحجر یہ سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہی مالک کا وہ بندہ ہے، ایک ہی قانون کا وہ پیرو ہے اور ایک ہی اطاعت کا حلقہ اسکی گردن میں پڑا ہے۔

اس طرح یہ روزہ انسان کی فرمانبرداریوں اور اطاعتوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی جانب پھیر دیتا ہے اور تیس دن تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے تک اسی سمت میں جمائے رکھتا ہے تاکہ اپنی بندگی کے مرجع اور اپنی اطاعت کے مرکز کو وہ اچھی طرح متحقق کرے اور رمضان کے بعد جب اس ڈسپلن کے بند کھولے جائیں تو اسکی اطاعتیں اور فرمانبرداریاں بکھر کر مختلف مرجعوں کی طرف بھٹک نہ جائیں۔ اطاعت امر کی اس تربیت کیلیے بظاہر انسان کی صرف دو خواہشوں (یعنی غذا لینے کی خواہش اور صنفی خواہش) کو چھانٹ لیا گیا ہے اور ڈسپلن کی ساری پابندیاں صرف انہی دو پر لگائی گئی ہیں، لیکن روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور اپنی بندگی و غلامی کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے، اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گذارے کہ ہر اس چیز سے رُکے جس سے خدا نے روکا ہے، اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشوونما دینا ہے نہ کہ محض کھانے پینے اور مباشرت سے روکنا۔ لہذا یہ کیفیت جتنی زیادہ ہو روزہ اتنا ہی مکمل ہے، اور جتنی اس میں کمی ہو اتنا ہی وہ ناقص ہے، حتی کہ اگر کسی آدمی نے روزہ اس احمقانہ طریقہ سے رکھا کہ جن جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے ان سے تو پرہیز کرتا رہا، اور باقی تمام اُن افعال کا ارتکاب کیے چلا گیا جنہیں خدا نے حرام کیا ہے، تو اس کے روزے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش کہ اس میں وہ اعضا تو سب کے سب موجود ہیں جن سے صورت انسانی بنتی ہے مگر جان نہیں ہے جسکی وجہ سے انسان انسان ہے۔ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ — جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اسکی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

جھوٹ بولنے کے ساتھ "جھوٹ پر عمل کرنے" کا لفظ جو ارشاد فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے در اصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اسکی نافرمانی کرتا ہے وہ حقیقت میں خود اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے۔ روزے کا اصل مقصد تو عمل سے اس اقرار کی تصدیق ہی کرنا تھا، مگر جب وہ روزے کے دوران میں اسی کی تکذیب کرتا رہا تو پھر روزے میں بھوک پیاس کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اسکے خلوئے معدہ کی کوئی حاجت نہ تھی۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں حضور نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

کم من صائم لیس لہٗ من صیامہ الا الظمأ وکم من قائم لیس لہٗ من قیامہ الا السہر

کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا انکے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام سے رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اور یہی بات ہے جس کو خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح تر الفاظ میں ظاہر فرمادیا کہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے۔ توقع ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگوگے۔

یعنی روزے فرض کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ تقویٰ کے اصل معنی حذر اور خوف کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد خدا سے ڈرنا اور اسکی نافرمانی سے بچنا ہے۔ اس لفظ کی بہترین تفسیر جو میری نظر سے گذری ہے، وہ ہے جو حضرت اُبی بن کعب نے بیان کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا "تقویٰ کسے کہتے ہیں"؟ انہوں نے عرض کیا "امیر المومنین آپ کو کبھی کسی ایسے رستے سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے جسکے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ تنگ ہو؟" حضرت عمر نے فرمایا "بارہا"۔ انہوں نے پوچھا "تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟" حضرت نے فرمایا "میں اپنا دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ دامن کانٹوں میں نہ اُلجھ جائے"۔

حضرت اُبی نے کہا "بس اسی کا نام تقویٰ ہے"۔ زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے، اور دونوں طرف افراط اور تفریط، خواہشات اور میلاناتِ نفس، وساوس اور ترغیبات (temptations) گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس راستہ پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعت حق کی راہ سے ہٹ کر بد اندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا، یہی تقویٰ ہے، اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے ہیں۔ یہ ایک مقوی دوا ہے جس کے اندر خدا ترسی و راست روی کی قوت بخشنے کی خاصیت ہے۔ مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی استعداد پر موقوف ہے۔ اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے، اور جو قوت روزہ دیتا ہے اسکو لینے کے لیے تیار ہو، اور روزہ کی مدد سے اپنے اندر خوف خدا اور اطاعت امر کی صفت کو نشوونما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اسکے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں میں وہ زندگی کی سیدھی شاہراہ پر دونوں طرف کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچائے ہوئے چل سکتا ہے۔ اس صورت میں اسکے لیے روزے کے نتائج (ثواب) اور منافع (اجر) کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو کر محض روزہ نہ توڑنے ہی کو روزہ رکھنا سمجھے اور تقویٰ کی صفت حاصل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں بھوک پیاس اور رت جگے کے سوا اور کچھ نہیں پا سکتا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة بعشر امثالها الى سبع مائة ضعف۔	آدمی زادے کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے۔ ایک نیکی دس گنی سے سات سو گنی تک پھلتی پھولتی ہے۔
قال الله تعالىٰ الا الصوم فانه لى و انا اجزى به۔	مگر اللہ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے، وہ میری مرضی پر موقوف ہے، جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں۔

یعنی روزے کے معاملہ میں بالیدگی و افزونی کا امکان بے حد و حساب ہے۔ آدمی اس سے تقویٰ

حاصل کرنے کی جتنی کوشش کرے اتنا ہی وہ بڑھ سکتا ہے۔ صفر کے درجہ سے لیکر اوپر لاکھوں، کروڑوں، اربوں سے گنے تک وہ جا سکتا ہے بلکہ بلانہایت ترقی کر سکتا ہے۔ پس یہ معاملہ چونکہ آدمی کی اپنی استعداد، اخذ و قبول پر منحصر ہے کہ روزہ سے تقوی حاصل کرے یا نہ کرے، اور کرے تو کس حد تک کرے، اس وجہ سے آیت مذکورۂ بالا میں یہ نہیں فرمایا کہ روزے رکھنے سے تم یقیناً متقی بن جاؤگے، بلکہ لعلکم[1] کا لفظ استعمال فرمایا جس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ توقع کی جاتی ہے یا ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقوی کرنے لگو۔

تعمیر سیرت یہ تقوی ہی دراصل اسلامی سیرت کی جان ہے۔ جس نوعیت کا کیرکٹر اسلام ہر مسلمان فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا اساسی تصور اسی لفظ تقوی کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل اس لفظ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طرز کی شکل و وضع بنا لینا، چند مشہور و نمایاں گناہوں سے بچنا اور بعض ایسے مکروہات سے پرہیز کرنا جنہوں نے عوام کی نگاہ میں اہمیت اختیار کر لی ہے، بس اسی کا نام تقوی ہے۔ حالانکہ دراصل یہ ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ قرآن مجید انسانی طرز خیال و طرز عمل کو اصولی حیثیت سے دو بڑی قسموں پر تقسیم کرتا ہے:-

دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان:	ایک قسم وہ ہے جس میں انسان:
(۱) اپنے آپ کو ایک ایسے بالاتر حکمراں کا تابع اور اسکے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے اور یہ سمجھتے ہوئے	(۱) دنیوی طاقتوں کے ماسوا کسی بالاتر اقتدار کو اپنے اوپر نگراں نہیں سمجھتا اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ

[1] عام طور پر لوگ اس لفظ کا ترجمہ "تاکہ" کرتے ہیں۔ مگر یہ لغت کے اعتبار سے درست نہیں۔ لعل کا لفظ عربی میں امید، توقع، اندیشہ اور امکان بلا وثوق کا مفہوم ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بخلاف اسکے تاکہ میں محض تعلیل یا غرضیت کا مفہوم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو صرف فرضیت صوم کی غرض ہی بیان کرنی ہوتی تو لعلکم تتقون کے بجائے لتکونوا من المتقین فرمایا ہوتا۔ شاید لوگ اس موقع پر کلمۂ شک کو دیکھ کر اس کی حکمت نہ سمجھ سکے اسلیے انہوں نے لعل کا ترجمہ "تاکہ" کر دیا، تاکہ صحیح ترجمہ سے جو بات بنی نظر نہ آتی تھی وہ غلط ترجمہ سے بن جائے۔

اسے کسی فوق البشر حاکم کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔	زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے ایک بعد اپنی دنیوی زندگی کے پورے کارنامے کا حساب اس حاکم کو دینا ہے۔
(۲) دنیوی زندگی ہی کو زندگی، دنیوی فائدے ہی کو فائدہ اور دنیوی نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس بنا پر کسی طریقے کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ صرف دنیوی فائدے اور نقصان ہی کے لحاظ سے کرتا ہے۔	(۲) دنیوی زندگی کو اصل حیاتِ انسانی کا صرف ایک ابتدائی مرحلہ سمجھتا ہے اور ان فوائد و نقصانات کو جو اس مرحلہ میں ظاہر ہوتے ہیں، عارضی اور دھوکا دینے والے نتائج خیال کرتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ اُن مستقل فائدوں اور نقصانات کی بنیاد پر کرتا ہے جو آخرت کی پائدار زندگی میں ظاہر ہونگے۔
(۳) مادّی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو بے وقعت سمجھتا ہے اور مادّی نقصانات کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی نقصانات کو ہلکا خیال کرتا ہے۔	(۳) مادّی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور مادّی نقصانات کی بہ نسبت اخلاقی و روحانی نقصانات کو شدید تر خیال کرتا ہے۔
(۴) کسی مستقل اخلاقی دستور کی پابندی نہیں کرتا بلکہ موقع و محل (Circumstances) کے لحاظ سے خود ہی اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور دوسرے موقع پر خود ہی ان کو بدل دیتا ہے۔	(۴) ایک ایسے مستقل اخلاقی دستور کی پابندی کرتا ہے جس میں اپنی اغراض و مصالح کے لحاظ سے اس کو ترمیم و تنسیخ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی قسم کے طرزِ خیال و طرزِ عمل کا جامع نام قرآن نے ”فجور“[1] رکھا ہے اور دوسرے طرزِ خیال و عمل کو وہ ”تقویٰ“[2] کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ دراصل زندگی کے دو مختلف راستے ہیں جو بالکل

[1] آج کل کی اصطلاحوں میں ہم اسے مادّہ پرستی (Materialism)، افادیت (Utilitarianism)، مصلحت پرستی (Pragmatism) اور ابن الوقتی (Opportunism) کے ناموں سے موسوم کر سکتے ہیں۔

[2] مغربی ذہن چونکہ اس طرزِ خیال سے بڑی حد تک بیگانہ ہے اسلیے جدید زمانہ کی اصطلاحوں میں ایسے الفاظ مشکل سے مل سکیں گے جو تقویٰ کے مفہوم کو ادا کر سکیں۔

ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں، اور اپنے نقطۂ آغاز سے لیکر نقطۂ انجام تک کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ فجور کے راستے کو اختیار کرکے آدمی کی پوری زندگی اپنے تمام اجزاء اور تمام شعبوں کے ساتھ ایک خاص ڈھنگ پر لگ جاتی ہے جس میں تقویٰ کی ظاہری اشکال تو کہیں نظر آسکتی ہیں، مگر تقویٰ کی اسپرٹ کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا، کیونکہ فجور کے تمام فکری اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں اور تقویٰ کے فکری اجزاء میں سے کسی چیز کو بھی اُنکے اس مربوط نظام میں راہ نہیں مل سکتی۔ برعکس اس کے تقویٰ کا راستہ اختیار کرکے انسان کی پوری زندگی کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی طرز پر سوچتا ہے، دنیا کے ہر معاملہ اور ہر مسئلہ کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر موقع و محل پر ایک دوسرا ہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ ان دونوں راستوں کا فرق صرف انفرادی زندگی ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے۔ جو جماعت فاجر افراد پر مشتمل ہوگی یا جس میں فاجرین کی اکثریت ہوگی اور اہل فجور کے ہاتھ میں جس کی قیادت ہوگی اس کا پورا تمدن فاجرانہ ہوگا۔ اسکی معاشرت میں، اسکے اخلاقیات میں، اسکے معاشیات میں، اسکے نظام تعلیم و تربیت میں، اسکی سیاست میں، اسکے بین الاقوامی رویہ میں، غرض اسکی ہر چیز میں فجور کی روح کارفرما ہوگی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اسکے اکثر یا بعض افراد ذاتی خود غرضیوں اور منفعت پرستیوں سے بالاتر نظر آئیں، مگر زیادہ سے زیادہ جس بلندی پر وہ چڑھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو اُس قوم کے مفاد میں گم کردیں جسکی ترقی سے انکی اپنی ترقی اور جسکے تنزل سے ان کا اپنا تنزل وابستہ ہے۔ لہٰذا اگر شخصی سیرت میں فجور کا رنگ کم بھی ہوا تو اس سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ قومی رویہ بہرحال افادیت، ابن الوقتی، مصلحت پرستی اور ریاء و نمائش پرستی ہی کے اصولوں پر چلے گا۔ اسی طرح تقویٰ بھی محض انفرادی چیز نہیں ہے۔ جب کوئی جماعت متقین پر مشتمل ہوتی ہے یا اس میں اہل تقویٰ کی کثرت ہوتی ہے اور متقی ہی اسکے رہنما ہوتے ہیں، تو اسکے پورے اجتماعی رویہ میں ہر حیثیت سے خدا ترسی کا رنگ ہوتا ہے۔ وہ وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کے

لحاظ سے اپنا طرزِ عمل مقرر نہیں کرتی بلکہ ایک مستقل دستور کی پیروی کرتی ہے اور ایک اٹل نصب العین کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیتی ہے قطع نظر اسکے کہ دنیوی لحاظ سے قوم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے یا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ وہ مادی فائدوں کے پیچھے نہیں دوڑتی بلکہ پائدار اخلاقی و روحانی منافع کو اپنا مطمحِ نظر بناتی ہے وہ مواقع کے لحاظ سے اصول توڑتی اور بناتی نہیں ہے بلکہ ہر حال میں اصولِ حق کا اتباع کرتی ہے کیونکہ اسے اسکی پروا نہیں ہوتی کہ اسکی مدمقابل قوموں کی طاقت کم ہے یا زیادہ، بلکہ اوپر جو خدا موجود ہے وہ اس سے ڈرتی ہے اور اسکے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنے کا جو وقت بہر حال آنا ہے اسکی فکر اسے کھائے جاتی ہے۔

اسلام کے نزدیک دنیا میں فساد کی جڑ اور انسانیت کی تباہی و بربادی کا اصلی سبب "فجور" ہے۔ وہ اس فجور کے سانپ کو ہلاک کر دینا چاہتا ہے یا کم سے کم اسکے زہریلے دانت توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ اگر یہ سانپ جیتا رہے تب بھی انسانیت کو ڈسنے کی طاقت اس میں باقی نہ رہے۔ اس کام کے لیے وہ نوعِ انسانی میں سے ان لوگوں کو چن چن کر نکالنا اور اپنی پارٹی میں بھرتی کرنا چاہتا ہے جو متقیانہ رجحانِ طبع رکھتے ہوں۔ فجور کی جانب ذہنی رجحان (Bent of mind) رکھنے والے لوگ اسکے کسی کام کے نہیں، خواہ وہ اتفاقاً مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو گئے ہوں اور مسلم قوم کے درد میں کتنے ہی تڑپتے ہوں۔ اسے دراصل ضرورت ان لوگوں کی ہے جن میں خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، جو آپ اپنا حساب لینے والے ہوں، جو خود اپنے دل کی نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھیں، جنکو قانون کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کی حاجت نہ ہو بلکہ خود انکے اپنے باطن میں ایک محاسب اور آمر بیٹھا ہو جو انہیں اندر سے قانون کا پابند بناتا ہو اور ایسی قانون شکنی پر بھی روکتا ٹوکتا ہو جس کا علم کسی پولیس، کسی عدالت اور کسی رائے عام کو نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسے افراد چاہتا ہے جنہیں یقین ہو کہ ایک آنکھ ہر حال میں انہیں دیکھ رہی ہے، جنہیں خوف ہو کہ ایک عدالت کے سامنے بہر حال انہیں جانا ہے،

جو دنیوی منافع کے بندے، ہنگامی مصالح کے غلام اور شخصی یا قومی اغراض کے پرستار نہ ہوں، جن کی نظر آخرت کے اصلی و حقیقی نتائج پر جمی ہوئی ہو، جنکو دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے کا لالچ یا سخت سے سخت نقصان کا خوف بھی خداوند عالم کے دیئے ہوئے نصب العین اور اسکے بتائے ہوئے اصول اخلاق سے نہ ہٹا سکتا ہو، جنکی تمام سعی و کوشش صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو، جنہیں اس امر کا پختہ یقین ہو کہ پایان کار بندگی حق ہی کا نتیجہ بہتر اور بندگی باطل ہی کا انجام برا ہوگا، چاہے اس دنیا میں معاملہ برعکس ہو۔ پھر اس کو جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ ایسے آدمی ہیں جنکے اندر اتنا صبر موجود ہو کہ ایک صحیح اور بلند نصب العین کے لیے برسوں بلکہ ساری ساری عمر لگاتار سعی بے حاصل کر سکتے ہوں، جن میں اتنی ثابت قدمی ہو کہ غلط راستوں کی آسانیاں، فائدے، اور لطف و لذت، کوئی چیز بھی ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتی ہو، جن میں اتنا تحمل ہو کہ حق کے راستے پر چلنے میں خواہ کسی قدر ناکامیوں، مشکلات، خطرات، مصائب اور شدائد کا سامنا ہو، ان کا قدم نہ ڈگمگائے، جن میں اتنی یکسوئی ہو کہ ہر قسم کی عارضی اور ہنگامی مصلحتوں سے نگاہ پھیر کر اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلے جائیں، جن میں اتنا توکل موجود ہو کہ حق پرستی و حق کوشی کے دیر طلب اور دور رس نتائج کے لیے خداوند عالم پر بھروسہ کر سکیں خواہ دنیا کی زندگی میں اس کام کے نتائج سرے سے برآمد ہوتے نظر ہی نہ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کی سیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور جو کام اسلام اپنی پارٹی سے لینا چاہتا ہے اس کے لیے ایسے ہی قابل اعتماد کارکنوں کی ضرورت ہے۔

تقویٰ کی اس صفت کا ہیولیٰ (ابتدائی جوہر) جن لوگوں میں موجود ہو اُن کے اندر اس صفت کو نشوونما دینے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے روزے سے زیادہ طاقتور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ روزے کے ضابطہ پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آپ پر خود منکشف ہونے لگے گا کہ یہ چیز کس مکمل طریقہ سے ان صفات کو بالیدگی اور پائیداری بخشتی ہے۔ ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ روزہ خدا نے تم پر فرض کیا ہے۔ صبح

سے شام تک کچھ نہ کھاؤ نہ پیو - کوئی چیز حلق سے اتارو گے تو تمہارا روزہ ٹوٹ جائیگا - لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے اگر تم نے پرہیز کیا اور در پردہ کھاتے پیتے رہے تو خواہ لوگوں کے نزدیک تمہارا شمار روزداروں میں ہو مگر خدا کے نزدیک نہ ہوگا - تمہارا روزہ صحیح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ خدا کے لیے رکھو، اور نہ دوسری کسی غرض مثلاً صحت کی درستی یا نیک نامی کے لیے رکھو گے تو خدا کی نگاہ میں اسکی کوئی قیمت نہیں - خدا کے لیے اپنا روزہ پورا کرو گے تو اس دنیا میں کوئی انعام نہ ملے گا اور توڑ دو گے یا نہ رکھو گے تو یہاں کوئی سزا نہ دی جائیگی - مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے پیش ہو گے اسی وقت انعام بھی ملیگا اور اسی وقت سزا بھی دی جائیگی - یہ چند ہدایات دیکر آدمی کو چھوڑ دیا جاتا ہے - کوئی سپاہی، کوئی ہرکارہ اور کوئی سی آئی ڈی کا آدمی اس پر مقرر نہیں کیا جاتا کہ ہر وقت اسکی نگرانی کرے - زیادہ سے زیادہ رائے عام اپنے دباؤ سے اسکو اس حد تک مجبور کر سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے پیئے - مگر چوری چھپے کھانے پینے سے اسکو روکنے والا کوئی نہیں - اور اس بات کا حساب لینا تو کسی رائے عام یا کسی حکومت کے بس ہی میں نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے یا کسی اور نیت سے۔ ایسی حالت میں جو شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے، غور کیجیے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں:

۱ - اس کو خداوند عالم کی ہستی کا، اس کے عالم الغیب ہونے کا، اس کے قادر مطلق ہونے کا اور اس کے سامنے اپنے محکوم اور جواب دہ ہونیکا کامل یقین ہے اور اس پوری مدت میں جبکہ وہ روزے سے رہا ہے اسکے یقین میں ذرا تنزلزل نہیں آیا -

۲ - اس کو آخرت پر، اسکے حساب کتاب پر، اور اسکی جزا و سزا پر پورا یقین ہے اور یہ یقین بھی کم از کم اُن بارہ چودہ گھنٹوں میں برابر غیر متزلزل رہا ہے جب کہ وہ اپنے روزے کی شرائط پر قائم رہا۔

۳ - اسکے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے - وہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے - وہ اپنی نیت

کا خود محتسب ہے۔ اپنے دل کے حال پر خود نگرانی کرتا ہے۔ خارج میں قانون شکنی یا گناہ کا صدور ہونے سے پہلے جب نفس کی اندرونی تہوں میں اسکی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی وقت وہ اپنی قوت ارادی سے اس کا استیصال کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پابندی قانون کے لیے خارج میں کسی دباؤ کا وہ محتاج نہیں ہے۔

۴۔ مادیت اور اخلاق و روحانیت کے درمیان انتخاب کا جب اسے موقع دیا گیا تو اس نے اخلاق و روحانیت کو انتخاب کیا۔ دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اسکے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اسکے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان و تکلیف کو اس نے گوارا کیا، اور آخرت کے نفع کی خاطر دنیوی مضرت کو قبول کر لیا۔

۵۔ وہ اپنے آپ کو اس معاملہ میں آزاد نہیں سمجھتا کہ اپنی سہولت دیکھ کر اچھے موسم، مناسب وقت اور فرصت کے زمانہ میں روزہ رکھے، بلکہ جو وقت قانون میں مقرر کر دیا گیا ہے اسی وقت روزہ رکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے خواہ موسم کیسا ہی سخت ہو، حالات کیسے ہی ناسازگار ہوں، اور اسکی ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے اس وقت روزہ رکھنا کتنا ہی نقصان دہ ہو۔

۶۔ اُس میں صبر، استقامت، تحمل، یکسوئی، توکل اور دنیوی ترغیبات و تحریصات کے مقابلہ کی طاقت کم از کم اس حد تک موجود ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس کام کے دوران میں وہ رضا کارانہ اپنی خواہشات نفس کو روکتا ہے۔ سخت گرمی کی حالت میں پیاس سے حلق چٹخا جا رہا ہے، برفاب سامنے موجود ہے، آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا۔ بھوک کے مارے جان پر بن رہی ہے، کھانا حاضر ہے، چاہے تو کھا سکتا ہے، مگر نہیں کھاتا۔ جوان میاں بیوی ہیں، خواہش نفس زور کرتی ہے، چاہیں تو اس طرح تقضائے شہوت کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے، مگر نہیں کرتے۔ ممکن الحصول فائدوں سے یہ صرف نظر، اور ممکن الاحتراز نقصانات کی یہ پذیرائی، اور خود اپنے منتخب کیے ہوئے

طریقِ حق پر یہ ثابت قدمی کسی ایسے نفع کی امید پر نہیں ہے جو اس دنیا کی زندگی میں حاصل ہونے والا ہو بلکہ ایک ایسے مقصد کے لیے ہے جس کے متعلق پہلے ہی نوٹس دیدیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے اس کے حاصل ہونے کی امید ہی نہ رکھو۔

یہ کیفیات ہیں جو پہلے روزہ کا ارادہ کرتے ہی انسان کے نفس میں ابھرنی شروع ہوتی ہیں۔ جب وہ عملاً روزہ رکھتا ہے تو یہ بالفعل ایک طاقت بن جاتی ہیں۔ جب تیس دن تک مسلسل وہ اسی فعل کی تکرار کرتا ہے تو یہ طاقت راسخ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور بالغ ہونے کے بعد سے مرتے دم تک تمام عمر ایسے ہی تیس تیس روزے ہر سال رکھنے سے وہ آدمی کی جبلت میں پیوست ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اسیلیے نہیں ہے کہ یہ صفات صرف روزے ہی رکھنے میں اور صرف رمضان ہی کے مہینے میں کام آئیں، بلکہ اسیلیے ہے کہ اپنی اجزا سے انسان کی سیرت کا خمیر بنے، وہ فجور سے یکسر خالی ہو، اور اسکی ساری زندگی تقویٰ کے راستہ پر پڑ جائے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے روزہ سے بہتر کوئی طریق تربیت ممکن ہے؟ کیا اس کے بجائے اسلامی طرز کی سیرت بنانے کے لیے کوئی دوسرا کورس تجویز کیا جا سکتا ہے؟

(باقی)

اسلام میں اشتراکیت

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

اللہ کو شرک پسند نہیں، عبداللہ کو اسی لیے شرکت تک سے کراہت ہے۔ لیکن "اشتراک" اگرچہ "شرک" ہی سے ہے بایں ہمہ خود شرک سے ہر جگہ شرک باللہ ہی مراد نہیں۔ اپنے حصے کی زمین کسی کاشتکار کو نصف یا ثلث پیداوار کے معاہدہ پر دینے کو بھی شرک کہتے تھے۔ معاذؓ بن جبل کی حدیث میں ہے کہ انّه اجاز بين اهل اليمن الشرك۔ عمرؒ بن عبدالعزیز سے مروی ہے کہ ان الشرك جائزٌ محدثین نے اس کے معنی اشتراك فی الارض لیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الناس شركاء فی ثلاثٍ، "تین چیزوں میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں"، الكلاء، والماء، والنار "جانوروں کے علف میں، پانی میں، اور ایندھن میں"۔ محدثین اس کے لیے اصول قرار دیتے ہیں کہ كل عفوٍ غير مملوكٍ فالناس فيه مستوون، "فالتو چیز جو کسی کی ملکیت نہ ہو اس میں سب برابر ہیں"۔

تہذیب فرنگ نے اشتراکیت کو آجکل ایک مخصوص مذہب بنا رکھا ہے یہ مذہب کیا ہے اور کیسا ہے؟ اس سے یہاں بحث نہیں۔ عبداللہ کا مَبلَغ اسی حد تک ہے جہاں تک شریعت الٰہی میں آثار مل سکیں۔

جائز اشتراکیت کی استواری میں "زکاۃ" کو بڑا دخل ہے۔ واصل الزكاة: الطهارة والنماء، والبركة، والمدح۔ زکا کے اصل معنے ہیں پاکیزگی، افزائش، برکت، ممدوح بنانا۔ وكل ذلك قد استعمل فی القرآن والحديث۔ قرآن و حدیث میں یہ تمام معانی استعمال ہوئے ہیں۔

فالزکاۃ تطھیرٌ للمال، وتثمیرٌ واصلاحٌ، ونماء۔ زکاۃ مال کو طاہر کر دیتی ہے، پیداوار بڑھاتی ہے، صلاحیت لاتی ہے، اور دولت کو قابلِ نشوونما بناتی ہے۔

وعن علقمۃ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم: ان من تمام اسلامکم ان تؤدوا زکاۃ اموالکم۔ "تمہارے اسلام کی تکمیل اسی میں ہے کہ مال کی زکاۃ دو۔"

وعن انسٍ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم: اخرج الزکاۃ من مالك، فانھا طھورٌ یطھرك اللہ وتصل وتعرف حق السائل والجار والمسکین ولا تبذر تبذیرا۔ "مال کی زکاۃ نکالو، اس کے ذریعہ اللہ تمہیں پاک کریگا، صلۂ رحم کی توفیق دیگا، سائل اور ہمسایہ اور مسکین کی حق شناسی ہوگی، لیکن اسراف نہ کرنا، ہرگز نہ کرنا۔"

وعن بریدۃ: ما منع قومٌ الزکاۃ الا ابتلاھم اللہ بالسنین۔ "جس قوم نے زکاۃ روک دی اللہ تعالیٰ نے اسکو قحط و تنگدستی میں مبتلا کر دیا۔"

وعن ابن عمر: لا یقبل اللہ الایمان والصلاۃ الا بزکاۃ۔ "بدون زکاۃ دیے اللہ تعالیٰ نہ ایمان کو قبول کرتا ہے نہ نماز کو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ بن جبل کو یمن روانہ کر رہے ہیں، ہدایت یہ ہے کہ انك تاتی قوماً اھل الکتاب، تم ایک ایسی قوم میں جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں، فادعھم الی شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ، انھیں لا الٰہ الا اللہ کی دعوت دو اور میرے رسول اللہ ہونے کا اقرار لو، فان ھم اطاعوك لذلك فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم خمس صلوات فی کل یوم ولیلۃ، اگر وہ مان لیں تو کہو کہ اللہ تعالیٰ نے شب و روز میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، فان ھم اطاعوك لذلك فاعلمھم ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم تؤخذ من اغنیائھم وترد فی فقرائھم، اسکو بھی مان لیں تو کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر مال کی زکاۃ فرض کی ہے کہ دولتمندوں سے لی جائے

اور حاجتمندوں کو دی جائے، فان اطاعوك فایاك وکرائم اموالھم، یہ سب کچھ مان لیں تو خبردار ان کے منتخب مال پر دست درازی نہ کرنا، واتق دعوۃ المظلوم فانھا لیس بینھا وبین اللہ حجاب، مظلوم کی بددعا سے بچو، اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔

ولما توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف ابوبکر بعدہ وکفر من کفر من العرب قال عمر بن الخطاب لابی بکر: کیف نقاتل الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أمرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ، فمن قال لا الٰہ الا اللہ عصم منی مالہ ونفسہ الا بحقہ، وحسابہ علی اللہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رفیق اعلیٰ سے جاملے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آنحضرت کے جانشین ہوئے، بہتیرے عرب کافر ہوگئے، تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ جو لوگ کلمۂ طیبہ کے قائل ہیں آپ ان سے کیسے لڑینگے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا تھا کہ "مجھے حکم ہے کہ لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ لاالٰہ الا اللہ کے قائل ہوجائیں، جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اس کا مال اور اسکی جان بچ گئی، بجز حقوق کے کہ ناگزیر ہیں، اسکا حساب اللہ پر ہے"۔

فقال ابوبکر: واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلاۃ والزکاۃ، فان الزکاۃ حق المال، واللہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نماز اور زکاۃ کے درمیان جس نے تفریق کی اللہ شاہد ہے کہ میں تو اس سے ضرور لڑونگا۔ زکاۃ تو بیت المال کا حق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اگر سال بھر کا ایک بچہ پیش کرتے رہے ہوں اور مجھے نہ دیں تو ایسی حقیر شے کے روک رکھنے پر بھی اللہ شاہد ہے کہ میں لڑونگا۔

قال عمر بن الخطاب: فواللہ ماھو الا ان رأیت اللہ قد شرح صدر ابی بکر

للقتال، فعرفت انہ الحق۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اب میں نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کا سینہ فراخ کردیا تھا، شرح صدر فرمایا تھا کہ لڑنا ضروری ہے، اب میں سمجھا کہ حق وہی تھا جو ابوبکرؓ کہتے تھے

ان روایات و آثار کے زیر سایہ اب اصل مبحث پر نظر کیجیے۔

اصولِ تعاون

هَآ أَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ، فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخَلُ وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهِ، وَاللهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ، ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا أَمْثَالَكُمْ۔

تم لوگ سن رکھو کہ تمہیں راہ خدا میں خرچ کرنے کو بلایا جارہا ہے۔ اس پر بھی تم میں ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں، اور جو بخل کرتا ہے تو حقیقت میں خود اپنے ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اگر تم روگردانی کروگے تو تمہارے سوا دوسرے لوگوں کو لا بٹھائیگا، پھر وہ تم جیسے نہ ہونگے۔

قانون قدرت کا فیصلہ یہ ہے کہ دنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جسے اپنی زندگی کے وسائل فراہم کرنے کی توفیق ملی ہو۔ بابل کی عظیم الشان سلطنت کو یاد کرو۔ اس کے حیرت خیز تمدن کو دیکھو۔ دنیا کی وہ مشہور ترین قوم جس نے اپنی کلوں اور ایجادوں اور علم و فضل و تہذیب و شائستگی کے ذرائع سے عراق کو نمونۂ بہشت بنا رکھا ہو، جسکی عجیب و غریب مدنیت نے اس لق و دق میدان میں، جو آج ناحیۂ کوفہ کا میدان مشہور ہے، تمدنی و عمرانی حیثیتوں سے لندن اور پیرس کے عجائب جمع کر رکھے ہوں، جسکے باغ آویزاں اور جسر لرزاں کی نظیر چار ہزار برس گذرنے پر بھی زمانہ پیش نہ کر سکا، جسکی رفعت و شان و سربلندی کے افسانے آسمانی کتابوں میں بھی مذکور رہوں، اتنی بڑی اولوالعزم قوم کی ایسی شاندار ترقیاں کسطرح خاک میں مل گئیں کہ آج اس دنیا میں اس قوم کا ایک فرد بھی موجود نہیں۔ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ تمدن کے جھونکے آتے بھی ہیں اور چلے بھی جاتے ہیں۔ ترقی کا میدان وسیع بھی ہوتا ہے

اور تنگ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ تنزل اور خود فراموشی کی انتہائی مصیبتیں بھی کسی قوم کو یکبارگی فنا کر دینے میں کامیاب نہیں ہوتی ہیں۔ آریوں نے باختر سے نکل کر ہندوستان کا رُخ کیا اور قدیم ترین زمانے کے ہندوستانی باشندوں کو جنہیں عرف عام میں غیر آریہ کہا جاتا ہے، ان کے گھروں سے بیدخل ہی نہ کیا بلکہ اپنی بہترین طاقتوں کی کوششیں اس پر مرکوز کر دیں کہ جس طرح بھی ہو سکے یہ قوم مٹ جائے۔ یہ جابرانہ حملے اب تک جاری ہیں۔ مگر اتنے بڑے مقابلے میں بھی یہ وحشی قوم ہمت نہ ہاری اور آریوں کو اسکے فنا کر دینے میں تین ہزار برس کی طویل صدیاں بھی مدد نہ دے سکیں۔ آج بھی پہاڑوں کے دامن میں اس قوم کی یادگاریں بھیل، گونڈ، بھر کے نام سے ہندوستان پر اپنی قوم کی ملکیت کا ثبوت دینے کے لیے موجود ہیں۔ پھر کیا بات ہوئی کہ ان پیہم سخت گیریوں پر بھی اس وحشی قوم سے تو اب تک دنیا خالی نہیں ہوئی، اور وہ قوم ایسی مٹی کہ زمانے میں اس نسل کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہا؟

اس عقدے کو حل کرنے کے لیے قیاسات کے دامن میں پناہ لینے کی ضرورت نہیں۔ واقعات پر غور کرنے سے یہ راز خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ موسیو مورگن نے آثار قدیمہ کی تلاش میں بابل اور نینوی کی قدیم یادگاروں کا ایک بڑا ذخیرہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اینٹ اور پتھر کی سلوں پر خط تصویری میں صدہا کتابے ملے ہیں جن کا ترجمہ علمائے آثار نے کئی سال کی محنت سے شائع کیا ہے۔ اس ترجمہ کے جستہ جستہ مضامین سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بابل والوں میں خود غرضی و خود پسندی کارفرما تھی۔ اپنی قوم کے مستحقین کی نفع رسانی کا باقاعدہ انتظام نہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں یہ روش عام ہو گئی تھی اور ملک بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جسے اپنی فکر سے اتنی مہلت ملتی کہ اپنے درماندہ بھائیوں کی مشکلیں محسوس کر کے انکی دستگیری کے لیے کسی معقول انتظام کی تحریک کرتا۔ ایسی افسوسناک حالتیں جب کسی قوم میں وسیع ہوئی ہیں تو ان کا ازالہ اسی وقت ہوا ہے جب وہ قوم ہی فنا ہوئی ہے۔ قدرت نے

بابل والوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا اور اسی قانون کے اثر نے آخر اس قوم کو ایسا برباد کیا کہ اس نسل کی تمام یادگاریں ہمیشہ کیلیے معدوم و منقطع ہو گئیں۔

ہندوستان کے غیر آریوں کی یہ حالت نہ تھی۔ ممکن ہے وہ وحشی ہوں، غیر متمدن ہوں، زمانے کے ساتھ چلنے کے اصول سے بے خبر ہوں، اور ان میں اتنا بل بوتا بھی نہ ہو کہ آریوں کی زبردستی کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوتے۔ لیکن ان سب کمزوریوں کے ساتھ ان میں یہ بات تھی کہ آپس میں جسکو حاجت مند دیکھتے اسکی حاجت روائی کی کوئی نہ کوئی تدبیر کرتے۔ بعض حالتوں میں مفید تدبیریں بے قاعدگی کے ساتھ بھی جان بچانے کے لیے کافی ہو جاتی ہیں۔ سردیوں میں تم نے دیکھا ہوگا کہ جنگلوں میں درختوں کے تلے ان وحشی قوموں کے جھونپڑے ہیں، آگ روشن ہے، ایک شخص اٹھتا ہے، حشرات الارض پکڑ لاتا ہے، سب جمع ہو جاتے ہیں، بھونتے ہیں اور مل جل کر کھاتے ہیں۔

ہندوستان ہی میں بمبئی اور سورت کے پیروانِ زرتشت مجوسی بھی تمہارے درمیان رہتے بستے ہیں، انکی خوشحالی کا تذکرہ تم نے بارہا کیا ہوگا۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ رستم کا گرز، فریدوں کا درفش کاویانی، کیخسرو کا جام جہاں نما، نوشیروان کا تاج و تخت جس قوم سے چھن گیا ہو اور وہ پردیس میں غربت کی زندگی بسر کر رہی ہو، کیا سبب ہے، کہ اسکی قومیت میں اب تک زوال نہیں آیا؟ اس سوال کا جواب مجوسی قوم کی تنظیم ہے۔ انہوں نے اپنی آبادیوں کے مرکز میں باقاعدہ مجلسیں قائم کر رکھی ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی ہیں۔ ساری قوم ان مجلسوں سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کے کسی گوشے میں کوئی مجوسی مفلس ہو گیا ہو انجمن اپنے دفتر معلومات کے ذریعے اس کا پتا لگا کر اسکی بسر اوقات کے لیے فوراً کوئی نہ کوئی انتظام کریگی۔ غریب خاندانوں کی تعلیم اور بیروزگاروں کی معاش کا سامان اس انجمن کے فرائض میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طرح طرح کے مصائب و حوادث کا مقابلہ کرنے پر بھی یہ قوم زندہ ہے اور زندگی کے تمام آثار اس میں موجود ہیں۔

دنیا کی زندہ و مردہ قوموں کی اگر کوئی تاریخ لکھی جائے اور انکی موت و حیات کے اسباب پر فلسفۂ تاریخ کی روشنی ڈالی جائے تو صاف نظر آئیگا کہ ہر زمانے میں قوموں کی ہستی و نیستی میں اس خاص سبب کا ایک بڑی حد تک دخل رہا ہے۔ اسی نظام کے تحت رہ کر انھوں نے ترقی کی ہے اور پھر اسی نظام کی بربادی ان کے تنزل اور بربادی کا پیش خیمہ بنی ہے۔

اسلام کے قانون اساسی یعنی قرآن کریم نے اس مسئلہ پر کافی توجہ کی اور تصریح کر دی کہ اسلام کا جزو اعظم یہ ہے کہ معقول پیرایہ میں حاجت مندوں کی حاجت روائی کی جائے۔ وحی الٰہی نے اسی قاعدے کو اسلام کا اصولی قاعدہ قرار دیا اور علمی زبان میں اس کا نام اصول تعاون رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اصول کی پابندی کی نسبت مسلمانوں کو اتنی تاکید کی ہے کہ بہت کم فرائض کی نسبت ایسے جوش و خروش کے احکام ہونگے۔ ملاحظہ ہو:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ، وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ،	جو لوگ اپنے مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں انکی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات خوشے پیدا ہوئے ہر خوشے میں سو دانے، اور اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور گنجایش والا واقف ہے۔
اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ،	جو لوگ اپنے مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کیے پیچھے احسان نہیں جتاتے اور نہ ایذا دیتے ہیں ان کو انکا ثواب ان کے پروردگار کے پاس ملیگا، نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہونگے۔
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى، وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ،	نرمی سے جواب دینا اور در گزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جسکے دیئے پیچھے ایذا ہو اور اللہ بے نیاز بردبار ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ، كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا، لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا، وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ،

اے لوگو کہ ایمان لائے، اپنے صدقات کو احسان جتانے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح اکارت نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخر کا یقین نہیں رکھتا۔ اسکی مثال اس چٹان کی سی ہے کہ اس پر مٹی ہو، پھر اس پر برسا زور کا مینہ اور اسکو سپاٹ کر گیا۔ ریاکاروں کو ایسے خرچ سے کچھ بھی ہاتھ نہ لگیگا، اور اللہ ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔

جو لوگ اللہ کی رضاجوئی کیلیے اور اپنی نیت ثابت رکھ کے اپنے مال خرچ کرتے ہیں انکی مثال ایک باغ کی سی ہے جو بلندی پر ہے، اس پر پڑا زور کا مینہ تو وہ دوچند پھل لایا اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑا تو ہلکی پھوار بھی بس کرتی ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ۔

بھلا تم میں کوئی بھی اس بات کو پسند کریگا کہ اسکے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اسکے تلے نہریں بہہ رہی ہوں، ہر طرح کے پھل اسکو وہاں میسر ہوں، اس حال میں بڑھاپے نے اسکو آلیا اسکے ناتوان بچے ہیں، اب اس باغ پر چلا ایک بگولا جس میں تھی آگ، اباغ جل کر رہ گیا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم غور کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ

اے لوگو کہ ایمان لائے، اچھی چیزوں میں سے انفاق

طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ	کرو، جو تم نے کمائی ہوں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین
الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْہُ تُنْفِقُوْنَ،	سے پیدا کی ہوں۔ اور ناکارہ چیز کے دینے کا ارادہ بھی نہ کرنا
وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْہِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْہِ، وَ	کہ لگو اس میں سے خرچ کرنے حالانکہ وہی چیز کوئی تم کو دینی
اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ،	چاہے تو تم اسکو کبھی خوشدلی سے نہ لو، الّا یہ کہ اسکے لینے

میں چشم پوشی کر جاؤ۔ جانے رہو کہ اللہ بے نیاز سزاوار حمد ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ	شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا اور شرم کی بات پر برانگیختہ
بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا،	کرتا ہے۔ اور اللہ اپنی طرف سے معافی اور برکت کا تم سے
وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَ	وعدہ کرتا ہے اور اللہ گنجائش والا، سب کے حال سے آگاہ ہے
مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا،	جسے چاہتا ہے سمجھ دیتا ہے اور جسے سمجھ دی گئی تو بے شک
وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔	اس نے بڑی دولت پائی اور نصیحت بھی وہی مانتے ہیں جو ذی فہم ہیں۔
وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَۃٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ	جو خرچ بھی تم کرو یا کوئی منت مانو وہ اللہ کو معلوم
نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ، وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ	ہے۔ اور جو لوگ حق مارتے ہیں کوئی ان کا مددگار
مِنْ اَنْصَارٍ۔	نہ ہوگا۔
اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا	اگر صدقہ ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا اور اگر حاجت مندوں
ھِیَ، وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَآءَ	کو چھپا کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، ایسا دینا
فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَیُکَفِّرُ عَنْکُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِکُمْ	تمہارے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ
وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔	اس سے باخبر ہے۔
لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰىھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ	ان لوگوں کو راہ راست پر لانا تمہارے ذمے نہیں بلکہ اللہ
یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ	جسے چاہتا ہے راہ راست پر لاتا ہے۔ تم لوگ مال میں سے

فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔

جو کچھ بھی خرچ کرو گے تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔ اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ کی رضا کی امید ہی میں کرتے ہو اور تم لوگ مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرو گے تمہیں پورا پورا دیدیا جائیگا اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ،

صدقہ ان حاجت مندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے۔ بے خبر انکی خودداری کی وجہ سے انکو غنی سمجھتا ہے۔ تم انہیں دیکھو تو انکے چہروں سے صاف پہچان جاؤ۔ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے۔ جو کچھ بھی تم انفاق کرو گے اللہ اسکو جانتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

جو لوگ رات اور دن، چھپے اور ظاہر اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کے دینے کا ثواب انکے پروردگار کے ہاں انہیں ملیگا، نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ آزردہ خاطر ہونگے۔

ان آیات سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ اللہ کی راہ میں دینے کا بہت زیادہ ثواب ہے۔

۲۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے خسارہ میں نہ رہینگے، اکئی گونہ زائد بدلہ ملیگا اور وہ خوف ورنج سے محفوظ رہینگے۔

۳۔ اللہ کی راہ میں دے کر احسان جتانا اور حاجت مندوں کو ستانا بہت برا ہے۔ اس سے نیکی برباد جاتی ہے۔

۴۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرنا قابل ملامت ہے۔ یہ اپنے کیے پر خود پانی پھیرتا ہے۔

۵- اللہ کی راہ میں بری چیز نہ دینی چاہیے۔

۶- یہ خیال غلط ہے کہ اللہ کی راہ میں دینے سے ہم محتاج ہو جائینگے۔

۷- اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جاتا ہے اللہ کو اس کا علم ہے۔

۸- علانیہ اور پوشیدہ دونوں صورتوں میں دینا درست ہے، مگر چپ چپاتے دینا بہتر ہے۔

۹- اللہ کی راہ میں دینا دینے والے ہی کے لیے مفید ہے۔

۱۰- اس کے مستحق وہ حاجت مند ہیں جو اپنی خودداری کے سبب بظاہر بے نیاز نظر آتے ہوں اور اللہ پر بھروسہ کئے بیٹھے ہوں۔

۱۱- صدقہ مانگنے کے لیے لوگوں کے پیچھے پڑنا بہت برا ہے۔

۱۲- بھیک مانگنا ممنوع ہے۔

۱۳- بہترین خیرات وہ ہے جو دن رات ہو، خیر جاری کی طرح اس کا سلسلہ وسیع رہے۔

۱۴- خیر جاری کرنے والوں کو اللہ پورا پورا معاوضہ دیگا اور وہ اچھی طرح خوش کئے جائینگے۔

ان آیات کے ساتھ اگر وہ آیت بھی شامل کر لی جائے جو طرزِ تحریر و عنوان فصل ہے تو اس سے دو نہایت اہم نتیجے نکلتے ہیں:

۱- اللہ کی راہ میں دیتے ہوئے بخل سے کام لینا خود ہمارے لیے موجب نقصان ہے، اللہ کو ہمارے صدقات و خیرات کی احتیاج نہیں، ہمیں اسکے محتاج ہیں، وہ تو بے نیاز ہے، اور اس دینے میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔

۲- اگر ہم نہ دینگے اور اللہ کے حکم سے منہ موڑینگے تو ہم فنا کر دیے جائینگے، اللہ بجائے ہمارے کسی دوسری قوم کو لا بٹھائیگا۔

آخری نتیجے وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم کو پڑھو اور سوچو کہ اصولِ تعاون کا دائرہ

کس قدر وسیع ہے کہ قوم کی موت وحیات اسی پر منحصر ہے - زندہ وہی قوم رہیگی جو اس ضابطے کی پابند ہوگی، ورنہ قانون قدرت اس کو فنا کر دیگا اور کسی دوسری قوم کو اس کا قائم مقام بنا دیگا۔ اس حالت میں مسلمانوں کو اختیار ہے کہ اپنی زندگی کو ترجیح دیتے ہوں تو حاجت مندوں کی حاجت روائی کا انتظام کریں، ورنہ جو کیفیت اس وقت ہے یہ تادیر رہنے والی نہیں ہے۔ موت اسکے ساتھ لگی ہے۔ جس طرح (چار سو برس میں) ہندوستان کی سرزمین تیموریوں کو کھا گئی کہیں مسلمانوں کی قوم ہی اس تباہی وخستگی کی نذر نہ ہو جائے

برلب بحر فنا منتظریم اے ساقی　　فرصتے داں کہ زلب تا بدہاں ایں ہمہ نیست

اسلام نے اصولِ تعاون کو کیونکر ترقی دی

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۔	اور اللہ نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، اگر تم صلوٰۃ کو قائم رکھتے زکوٰۃ دیتے، ہمارے رسولوں پر ایمان لاتے، اور ان کی مدد کرتے اور خوشدلی سے اللہ کو قرض دیتے رہو گے تو ہم ضرور تمہارے گناہ تم سے دور کر دینگے اور ضرور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرینگے جنکے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی۔ اسکے بعد تم میں سے جو انحراف کریگا وہ ٹھیک ٹھیک سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ دنیا کے لیے جو کام مفید ہوتے ہیں اور جن پر دنیا والوں کی کامیابی منحصر ہوتی ہے وہ ان کاموں کی جانب اپنے پیروؤں کو ترغیب سے، ترہیب سے، وعدہ وعید سے، غرض جس طرح بھی مناسب ہوتا ہے، مائل کرتا ہے۔ جس کام میں نوع انسان کے لیے سب سے زیادہ فائدے مضمر ہوتے ہیں وہ "فرض" قرار پاتا ہے کہ اسکے ذریعے لوگوں کو فلاح ہو، اور جس میں اتنا فائدہ نہیں ہوتا اسکو درجہ بدرجہ سنت، نفل، مستحب

وغیرہ کے مراتب میں جگہ ملتی ہے۔

حاجت مندوں کی ضرورتوں کے رفع کرنے اور ایک منتظم شکل میں اس کام کو چلانے پر مسلمانوں کی جماعت کے قیام کا انحصار تھا اور کوئی ایسی صورت نہ تھی کہ بغیر اس ضابطے کے اسلامی شائستگی دنیا میں سنبھلی رہ سکے۔ اسلیے وحی الٰہی نے اسکی ادامت فرض قرار دی، اور قرآن حکیم کی تعلیمات نے اس فرض پر اتنا زور دیا کہ اس فرض کو نہایت ہی عظیم اہمیت حاصل ہوگئی، اور اس کے لیے ذیل کے احکام مقرر ہوئے:

۱۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جائے اس کا شرعی نام صدقہ ہے۔ صدقہ کی دو صورتیں ہیں: ایک وہ جو ہر شخص اپنی خواہش اور حیثیت اور معاشی حالت کے مطابق دیتا ہو، اس میں مقدار کی کوئی قید نہیں، جتنا جسکے جی میں آئے خیرات کرے۔ دوسرے وہ جس میں تمام مالدار مسلمان محکوم ہیں کہ اپنی ملت کے فائدے کے لیے سالانہ ایک خاص مقدار میں ٹیکس ادا کرتے رہیں۔ اس ٹیکس کا نام زکاۃ و صدقہ ہے، اور اس پر عملدرآمد یا اس کا ترک کفر و اسلام کا معیار قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ ہر آسودہ حال مسلمان پر زکاۃ فرض ہے اور جب تک یہ فرض ادا نہ ہو اسکی تمام عبادتیں اور نیکیاں بے سود ہیں۔ شریعت نے آسودگی کا نصاب بھی متعین کر دیا ہے۔

۳۔ زکاۃ دینے سے مال کا بقیہ حصہ پاک ہو جاتا ہے اور اگر نہ دی جائے تو وہ مال ناپاک محض ہے۔

۴۔ خیرات و زکاۃ میں دولت کا صرف گویا اللہ کو قرض دینا ہے، اسکی وجہ سے انسان کی بخشائش ہوتی ہے۔

۵۔ جو اس سے انحراف کرے وہ گمراہ ہے۔

ان احکام کی بنا پر زکاۃ کے لیے ایک خاص نظام تجویز ہوا اور اسکو ایک مخصوص ادارہ سے متعلق کیا گیا۔ اس ادارہ کا نام "بیت المال" تھا اور اس کا باقاعدہ افتتاح تقریباً ۱۵ھ ہجری میں ہوا۔

بیت المال کی بعض قابلِ ذکر خصوصیتیں جن کو ہمارے موضوع بیان سے تعلق ہے یہ تھیں:

۱۔ بیت المال کا مرکزی ادارہ مدینہ مبارکہ میں تھا لیکن اسکی شاخیں ممالک مفتوحہ و محروسہ کے ہر ناحیہ اور ہر صدر مقام میں قائم تھیں مسلمانوں کی ہر قسم کی ملی و دینی ضروریات کی کفالت اسی ادارے سے متعلق تھی مستحقین کے وظائف تھے۔ اشاعت اسلام کا مادی و اخلاقی دونوں طریقوں سے نہایت وسیع پیمانے پر انتظام تھا۔ اسلامی تہذیب کو قرآن کریم کے معیار پر رکھنے، جائز وسائل سے اس کی اشاعت کرنے اور دنیا کو اسکے زیر سایہ لانے کا بندوبست تھا۔ رفاہ عام کے تمام کام اسی محکمہ سے انجام پاتے تھے۔ تعلیم بڑی اولوالعزمی کے ساتھ عام طور پر دی جاتی تھی۔ مرد و عورت سب اس سے حکماً مستفید ہوتے تھے، الیٰ غیر ذالک۔ صوبوں اور ضلعوں میں بیت المال کی جس قدر شاخیں تھیں ان کا یہ انتظام تھا کہ ان تمام مصارف کے لیے جس قدر مال مقامی ضروریات کے لیے درکار ہوتا رکھ لیا جاتا اور باقی مرکزی ادارہ کو بھیجد یا جاتا۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصر کے والی عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو فرمان لکھا تھا اس میں یہ صاف تصریح موجود ہے (کنز العمال، ج ۳، صفحہ ۱۶۳)

۲۔ تعلیمی آسانیوں کے لیے بیت المال سے مناسب وسائل فراہم تھے۔ اسلام سے قبل عام تعلیم کا سرے سے رواج ہی نہ تھا اور اگر برائے نام کہیں کچھ تھا بھی تو بہت ہی محدود۔ کسی ذی علم کو شوق ہوا اور وقت بھی ملا تو اس نے چند شاگردوں کو پڑھا دیا۔ لیکن چونکہ اس کے لیے کسی معاوضے کا دستور نہ تھا اس لیے اس ایثار نفس کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اسلام کے زیر سایہ جب عام تعلیم کا بندوبست ہوا تو ساتھ ہی اساتذہ اور افسران تعلیم بھی مقرر ہوئے جنکو بیت المال سے عطائیں ملتی تھیں (سیرۃ العمرین لابن الجوزی)

۳۔ اسلامی تہذیب و تمدن اور آداب و اخلاق کی بنیاد صرف قرآن حکیم پر تھی اسلیے اسکی تعلیم لازمی و جبری کر دی گئی۔ چند تعلیمی افسر مقرر تھے جن کا کام یہ تھا کہ تمام قبائل میں پھر کے ہر شخص کا امتحان لیں اور جو قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہو اسکو سزا دیں (کتاب الاغانی، ج ۱۶، ص ۵۸)

۴۔ بیت المال کی آمدنی سے جا بجا مکتب اور مدرسے قائم تھے جن میں لکھنے پڑھنے کے ساتھ

شہسواری کی تعلیم بھی دی جاتی تھی - ابو عامر سلیم کی روایت میں مدینۂ مبارکہ کمتب کا تذکرہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا (معجم البلدان، مادہ حاضر)

۵- عمال کو حکم تھا کہ جو لوگ قرآن حکیم کا درس لیں ان کے لیے بیت المال سے عطا مقرر کر دی جائے (کنز العمال، ج ۱، ص ۲۱۷)

۶- زبان کی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا - ادب و عربیت اور فرائض کی تعلیم بھی لازمی تھی اور ان کے مصارف بیت المال کے ذمے تھے - حکم تھا کہ جو کوئی لغت کا عالم نہ ہو قرآن کریم کی تعلیم نہ دینے پائے (کنز العمال، ج ۱، ص ۲۲۸)

۷- ممالک محروسہ میں جا بجا بڑے بڑے اکابر مامور تھے کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دیا کریں - کوفہ میں عبداللہ بن مسعود، بصرہ میں معقل بن یسار و عبداللہ بن مغفل و عمران بن حصین، شام میں عبادہ بن صامت و ابو درداء رضی اللہ عنہم حدیث کی تعلیم و روایت کے لیے متعین تھے - اور تاکید تھی کہ عوام اس فن میں ان بزرگوں کے علاوہ کسی سے رجوع نہ کرنے پائیں (اسد الغابہ، ترجمہ عبداللہ بن مغفلؓ)

۸- چونکہ فقہ پر معاملات و عبادات کی صحت کا مدار ہے اسلیے ہر شہر میں متعدد فقہا اس فن کی تعلیم کے لیے متعین تھے - بصرہ میں دس اہل کمال اس فن کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے - شام میں عبدالرحمٰن بن غنم و عبادہ و معاذ بن جبل و ابو درداء رضی اللہ عنہم اسکی تعلیم کے ذمہ دار تھے - مصر میں حبان بن ابی جبلہ رئیس التعلیم تھے - تمام علاقوں میں یہی انتظام تھا - وقت کی ضرورت کے مطابق بڑے بڑے ماہران فن افسر تعلیم مقرر تھے، اور اسکے تمام مصارف بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے -

ان انتظامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں تعلیم عام ہو گئی - ہر شہر میں کئی کئی ہزار طالب العلم ایک ایک حلقۂ درس میں زیر تعلیم رہا کرتے - علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ نماز فجر کے بعد ابو درداء رضی اللہ

عنہ جب حلقۂ درس میں بیٹھتے تھے تو قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا انکے گرد ہجوم ہوتا تھا۔ ابو درداء نے دس دس طلبہ کی جماعتیں مقرر کردی تھیں۔ ہر جماعت کا ایک خاص معلم ہوتا تھا۔ خود ٹہلتے جاتے اور سب کی نگرانی کرتے۔ جب کوئی طالب علم پورے قرآن کی تعلیم و تجوید سے فارغ ہو چکتا تو وہ خاص ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوتا۔ ایک دفعہ شمار ہوا تو خود اُن کے حلقۂ درس میں بیٹھنے والوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تھی۔ اور ان کے علاوہ بارہ ہزار چار سو طلبہ ان کے زیر نگرانی علوم قرآن کی تعلیم پا رہے تھے۔

عام تعلیم کی یہ کیفیت تھی کہ آٹھ آٹھ برس کے لڑکے قرآن کریم حفظ کر لینے کے ساتھ تفسیر سے بھی مناسبت پیدا کر لیتے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں نحو، ادب، بلاغت، فقہ، حدیث اور علم کلام کی تکمیل ہو جاتی تھی (کتاب الامامۃ والسیاسۃ، ج ۲، ص ۱۳۱)۔

یعنی اس زمانہ میں جتنے علوم مروج تھے بیت المال سے ان سب کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اور بہت ہی کم مدت میں طالب علم فارغ التحصیل ہو جاتے تھے۔ ہر فن کی منتخب کتابیں بہت مختصر تعداد میں پڑھائی جاتی تھیں۔ نصاب تعلیم کی تنقیح پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جاتا تھا۔ کتابوں کی تبدیلی میں یہ رعایت ملحوظ ہوتی تھی کہ سال بسال جس فن میں نئی ترقیاں ہوتی رہیں نصاب تعلیم ان سب پر حاوی ہو۔ اور اسکے لئے ایسے لوگ مامور تھے جو اکثر اوقات یک فنی ہوتے۔

ان تفصیلات سے اہل نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ ابتدائی صدیوں میں اسلامی تمدن کو کن وسائل سے ترقی نصیب ہوئی۔ وہ کونسی طاقت تھی جس نے مسلمانوں کو دنیا کی ثروت و شائستگی کے وارث بننے میں مدد دی تھی، اور امام مالک کے قول العلم والدین توأمان کا کیا فلسفہ تھا اور دنیا پر اس سے کیا اثر پڑا۔

مگرش چشم سیاہ تو شد کار آموز ورنہ مستوری و مستی ہمہ کس نتوانند

رسائل و مسائل

"پردہ" پر تنقیدی نظر

(از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

ادھر ترجمان القرآن کے کئی نمبروں میں، پردہ پر جو عالمانہ مقالہ آپ نے لکھا ہے، اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جو لوگ غرور جہل کی وجہ سے اس بارہ میں اسلامی قوانین و احکام کا مضحکہ اڑا رہے تھے، اُن پر آپ نے تمام علمائے اسلام کی طرف سے حجت تمام کر دی، جسکے لیے آپ تمام مذہبی حمیت رکھنے والے مسلمانوں کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

مضمون کی جو قسط ترجمان القرآن جلد ۱۶ - عدد ۲ میں شائع ہوئی ہے وہ میرے سامنے ہے۔ اس میں "پردہ کے احکام" کے عنوان سے جو فصل آپ نے لکھی ہے، اسکو میں نے خاص اہتمام سے پڑھا میرے خیال میں یہ فصل کتاب کی اصلی فصل ہے اور خلاصہ مباحث کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھکو افسوس ہے کہ میں اس فصل سے مطمئن نہیں ہوا۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میری طرح اور بہت سے لوگ بھی اس میں اضطراب محسوس کرینگے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ آپ کو اس کی طرف توجہ دلاؤں تاکہ مضمون کو بصورت کتاب چھاپتے وقت، اگر آپ ضرورت محسوس کریں، اس بحث کو اور زیادہ صاف کر دیں اور اگر اس عریضہ کو رسالہ میں قابل بحث و نظر خیال فرمائیں تو مجھکو اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

آپنے اس فصل میں سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی آیات متعلق پردہ نقل کرنے کے بعد ان کے نتائج سے بحث کی ہے اور آخر میں الا ما ظھر منھا کی تاویل میں علماء و فقہا کے اختلافات نقل

کرنے کے بعد آپ لکھتے ہیں :-

"الا ما ظہر منہا کو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی مقید نہ کیجیے - ایک مومن عورت جو خدا اور رسول کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جسکو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہو وہ خود اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں، کب کھولے اور کب نہ کھولے، کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے - اس باب میں قطعی احکام نہ شارع نے دیے ہیں، نہ اختلاف احوال و ضروریات کو دیکھتے ہوئے یہ مقتضائے حکمت ہے کہ قطعی احکام وضع کیے جائیں - جو عورت اپنی حاجات کے لیے باہر جانے اور کام کاج کرنے پر مجبور ہے اسکو کسی وقت ہاتھ بھی کھولنے کی ضرورت پیش آئیگی اور چہرہ بھی - ایسی عورت کے لیے بلحاظ ضرورت اجازت ہے اور جس عورت کا حال یہ نہیں ہے اس کے لیے بلا ضرورت قصداً کھولنا درست نہیں"

(ترجمان القرآن ص ۱۴۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ الا ما ظہر منہا کے استثناء میں چہرہ کو داخل سمجھتے ہیں اور ضرورت کے وقت چہرہ کھولنے اور نہ کھولنے اور اوقات ضرورت کی تعیین اور کھولنے کی مقدار سے متعلق شارع نے، آپکے خیال میں، قطعی احکام نہیں دیے ہیں - اور نہ حالات و ضروریات کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے اس بارہ میں قطعی احکام کا وضع کرنا، آپ کے نزدیک مقتضائے حکمت تھا - آپکے نزدیک اس باب میں اصلی قاضی و مفتی خود مومنہ عورت کی صواب دید ہے - وہ اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں، کب کھولے اور کب نہ کھولے، کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے -

اس کے بعد آپ "حالات سے قطع نظر کر کے" نفس چہرہ کا حکم بیان کرتے ہیں اور سورۂ احزاب کی آیت "یدنین علیھن" الآیہ کے احکام بیان کرتے ہوئے چہرہ کی فتنہ سامانیوں کا ذکر ان لفظوں

میں فرماتے ہیں :-

"جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اسکے ساتھ کچھ عقل عام بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے جنکو اسلام اسقدر اہمیت دے رہا ہے - ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اسکا چہرہ ہی تو ہے - انسان کی خلقی و پیدائشی زینت یا دوسرے الفاظ میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے - نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے - جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے - صنفی جذب و انجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے ...... اگر اصل مقصد اسی طوفان کو روکنا ہو تو اس سے زیادہ خلاف حکمت اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے" (ترجمان القرآن)

ان دونوں عبارتوں پر غور فرمائیے کہ ایک طالبعلم ان میں کیسے توازن پیدا کر سکیگا! ایک طرف تو آپ کے نزدیک چہرہ کی یہ اہمیت ہے کہ سارے فتنے گویا اسی کے دم قدم سے ہیں اور آپ بجا طور پر اسکو بالکل خلاف حکمت سمجھتے ہیں کہ "فتنہ کے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور اس سب سے بڑے دروازہ کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے" دوسری طرف آپ فرماتے ہیں کہ یہ سوال کہ چہرہ کب کھولا جائے، کتنا کھولا جائے، کھولا جائے یا نہ کھولا جائے، شارع کے حدود حکم و قضا سے باہر ہے - ان کے متعلق فیصلہ کرنے والی ذات خود عورت ہے - اگر شارع اسکے متعلق قوانین وضع کرتا تو یہ بات مقتضائے حکمت کے خلاف ہوتی - یہ دونوں باتیں ایک ساتھ کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آئیں - چہرہ اگر اس درجہ اہم چیز ہے تو اسکے متعلق صاف اور واضح، محدود و متعین احکام دین میں ہونے چاہییں - اس کے کھولنے کے اوقات معلوم ہونے چاہییں - ایسے اہم مسئلہ کا انحصار صرف عورت کی ذات پر درانحالیکہ اس معاملہ میں عورت کی دیانت داری ہمیشہ مشتبہ رہیگی اور ویسے بھی شریعت نے اس قسم کے معاملات میں

کبھی عورت کی قوت فیصلہ پر اعتماد نہیں کیا ہے) کسی طرح بھی قرین حکمت نہیں ہے۔ اور اگر سچ مچ معاملہ کی نوعیت یہی ہے جو آپ کے مضمون سے معلوم ہوتی ہے تو پردہ کے معاملہ میں زیادہ طوفان اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضروریات کا دامن بہت وسیع ہے۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے اور کل جو کچھ ہوگا وہ سب اس کے تحت میں آجائے گا۔[1]

[1] یہ بات اگر کسی غیر فقیہ آدمی نے لکھی ہوتی تو چنداں تعجب نہ ہوتا، مگر فاضل تنقید نگار کے متعلق میرا گمان ہے کہ وہ تفقہ سے کافی بہرہ رکھتے ہیں اسلیے مجھے ان سے یہ اعتراض سُن کر فی الواقع سخت تعجب ہوا۔ انہوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ قانون میں امر و نہی کے احکام ہمیشہ معمولی حالات کیلیے دیے جاتے ہیں اور غیر معمولی حالات کے لیے استثناء کی جو صورت رکھی جاتی ہے وہ عموماً مجمل ہوتی ہے۔ چونکہ غیر معمولی حالات کا تعلق ایک ایک فرد کی زندگی کے جزوی مواقع سے ہوتا ہے اسلیے تفصیل کیساتھ تمام ممکن جزئیات کو منضبط کرنا اور ہر ایک موقع کے لیے علٰحدہ حکم دینا محال ہے۔ ایسے مواقع پر اس بات کا فیصلہ کہ آیا یہ غیر معمولی موقع ہے یا نہیں، اور اس میں قانون کے استثناء سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں، اور کس حد تک اٹھانا چاہیے، اسکا انحصار زیادہ تر خود اس شخص کی رائے پر ہوتا ہے جو اس حالت میں ہو۔ اگر وہ نیک نیت آدمی ہے، دل سے قانون کی پابندی کرنا چاہتا ہے، نافرمانی و قانون شکنی کی طرف میلان نہیں رکھتا، اور قانون کی اسپرٹ کو بھی سمجھتا ہو تو وہ صحیح رائے قائم کریگا، اور اگر اسکا یہ حال نہیں ہے تو قانون کے استثناء سے غلط فائدہ اٹھائیگا۔ مثال کے طور پر قرآن میں کھانے کی بعض چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا کہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ دیکھیے، یہ استثنائی حکم کسقدر مجمل ہے۔ اضطرار کی تمام ممکن صورتوں کو بیان نہیں کیا گیا۔ نہ اضطرار کے درجات متعین کیے گئے۔ نہ یہ بتایا گیا کہ کس قسم کے اور کسقدر شدید اضطرار میں ان چیزوں کا کتنا کتنا استعمال جائز ہوگا۔ ان ساری تفصیلات کو چھوڑ کر صرف اتنا کہہ دیا گیا "اگر کوئی شخص مجبوری کی حالت میں کچھ کھالے بشرطیکہ اس کے اندر قانون شکنی کی خواہش نہ ہو اور وہ حد سے تجاوز نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں" یہاں فرد مومن کو (جس میں مومنہ عورتیں بھی شامل ہیں) آپ ہی اپنا محتسب بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر وہ باغی نہیں ہے بلکہ سچے دل سے اللہ کا مطیع ہے تو وہ خود ہی یہ فیصلہ کریگا کہ جس حالت میں مبتلا ہوں یہ اضطرار کی حالت ہے یا نہیں، اضطرار ہے تو کس حد تک ہے، اور مجھے اس حالت میں حرام چیز کس حد تک کھانی چاہیے کہ حدود کا مجرم نہ ہو جاؤں۔ آپ غالباً یہاں بھی یہی فرمائینگے کہ کھانے پینے کے معاملہ میں تو آدمی کی دیانت ہمیشہ مشتبہ رہی ہے اسکی رائے پر اس معاملہ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹ پر دیکھیے)

آخر میں آپ نے اس کھٹک کو دور کرنے اور اپنے خیالات کو مربوط کرنے کی جو سعی فرمائی ہے ۔ مجھے اس سے بھی اختلاف ہے ۔ آپ فرماتے ہیں ۔

"اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جب ایسا ہے تو اسلام نے حاجات و ضروریات کیلیے چہرہ کھولنے کی اجازت کیوں دی (جیسا کہ تم خود پہلے بیان کر چکے ہو ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا قانون کوئی غیر معتدل اور یک رخا قانون نہیں ہے ۔ وہ ایک طرف مصالح اخلاقی کا لحاظ کرتا ہے تو دوسری طرف انسانی ضروریات کا بھی لحاظ کرتا ہے ۔ اور ان دونوں کے درمیان اس نے غایت درجہ کا تناسب اور توازن قائم کیا ہے ۔ وہ اخلاقی فتنوں کا سدباب بھی کرنا چاہتا ہے اور اسکے ساتھ کسی انسان پر ایسی پابندیاں بھی عائد نہیں کرنا چاہتا جنکے باعث وہ اپنی حقیقی ضروریات کو پورا نہ کر سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کیلیے چہرہ اور ہاتھ کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں کیونکہ ستر پوشی اور اخفائے زینت سے ضروریات زندگی کو پورا کرنے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا تھا مگر چہرے اور ہاتھوں کو دائماً چھپائے رہنے سے عورتوں کو اپنی حاجات میں سخت مشکل پیش آسکتی ہے ۔ پس عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ چہرے پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں اور اس قاعدہ میں الا ما ظہر منہا کے استثناء سے یہ آسانی پیدا کر دی گئی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۸) چھوڑنا ٹھیک نہیں ، اسکے متعلق تو دین میں واضح اور متعین احکام ہونے چاہییں ۔ نیز شاید آپ یہ بھی فرمائیں کہ اگر یونہی اضطرار کے بہانے سے وہ سب کچھ کھانے پینے کی اجازت دیدینی تھی جسے حرام کیا گیا ہے تو یہ حرمت و حلت کا طوفان اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی ، مجبوریوں کا دامن تو اسقدر وسیع ہے کہ جو کچھ آدمی کھانا یا پینا چاہے اسکے لیے مجبوری کا بہانہ پیدا کر سکتا ہے ۔ لیکن آپ اسکا کیا علاج کرینگے کہ شارع نے قریب قریب اپنے تمام احکام میں یہی روش اختیار کی ہے ۔ اس نے یہ شریعت ان لوگوں کے لیے نہیں بنائی ہے جو قانون کو توڑنے کی خواہش رکھتے ہوں اور دائرۂ اطاعت سے نکلنے کیلیے بہانے ڈھونڈتے ہوں ۔ ایسے لوگوں کیلیے تو اسکے پاس صرف جہنم کی آگ ہی ہے ۔ رہے اسکے احکام تو ان میں اس کا خطاب منافقین کی طرف نہیں بلکہ ان مردوں اور عورتوں کی طرف ہے جنکے اندر خدا کا خوف اور اطاعت کی آمادگی موجود ہو ۔ اور ایسے مومنین و مومنات کی دیانت پر وہ نہ صرف اعتماد کرتا ہے بلکہ ان سے امید رکھتا ہے کہ استثنائی صورتوں میں وہ بہانہ طلبی کرنے کے بجائے حقیقی مجبوری کے مواقع پر بھی خدا سے ڈرتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم رکھینگے ۔ اسی لیے احکام دینے کے ساتھ ان کنتم مومنین اور ان اتقیتن وغیرہ کے الفاظ فرمائے جاتے ہیں ۔ اور اسی اعتماد کی بنا پر نبی صلعم نے فرمایا کہ استفت قلبک (اپنے دل سے فتویٰ پوچھ) اور دع ما یریبک الی ما لا یریبک (جو چیز تیرے

ہے کہ حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اس کو کھول سکتی ہیں بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو، بلکہ رفع ضرورت مدنظر ہو۔ پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے ان کا سدباب اس طرح کیا گیا کہ مردوں کو غض بصر کا حکم دیدیا گیا تاکہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجت کے لیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کرلیں اور بیہودگی کیساتھ اسکو گھورنے سے باز رہیں۔" (ترجمان القرآن)

یہ عبارت بار بار پڑھنے کے باوجود سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تسلیم ہے کہ اسلام کا قانون یک رخا اور غیر معتدل نہیں ہے اس نے اخلاقی مصالح اور انسانی ضروریات میں کمال درجہ توازن و تناسب ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرے اور ہاتھ کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے ہیں جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں؟ چہرہ کے متعلق جو احکام ہیں انکے زور و قوت میں کوئی ضعف تو نہیں معلوم ہوتا! جس طرح زینت کے ابدار اور ستر کے مختلف مواضع کے اظہار کی ممانعت کی ہے اسی طرح چہرہ کے چھپانے سے متعلق بھی صریح نص موجود ہے۔ یاایھا النبی قل لازواجك وبناتك ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن۔ اور اس وسعت اور اہتمام کے ساتھ کہ اے نبی اپنی بیویوں، اپنی لڑکیوں اور تمام مسلمانوں کی عورتوں کو یہ حکم دیدو۔ اس حکم میں قطعیت اور احکام کا پورا زور پیدا کرنے کے لیے کس شے کی کمی رہ گئی ہے؟ اور ستر و اخفائے زینت سے متعلق احکام میں وہ کن صورتوں میں موجود ہے! اسکے متعلق قرآن میں نص صریح ہے، احادیث میں اسکے لیے امر و تاکید ہے، آٹھویں صدی تک کے مسلمانوں کا مجمع علیہ تفقہ اسکے متعلق آپ ہی نے نقل فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ "حالت احرام میں" باوجود ممانعت، ازواج مطہرات اور عام خواتین اسلام اپنے چہرہ کو چھپاتی تھیں، جسکے ثبوت میں حضرت عائشہ اور فاطمہ بنت منذر رضی اللہ عنہما کی روایتیں خود آپکے مضمون میں موجود ہیں۔ اخفائے زینت اور ستر پوشی کے احکام میں اس سے زیادہ اور کیا ہے؟[1]

---

[1] یہاں پھر مجھے یہ عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ احکام کو سمجھنے کے لیے صرف الفاظ کا علم کافی نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱ پر دیکھیے)

دوسری بات آپ نے اس سے بھی عجیب تر کہدی ہے کہ "عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا ہے کہ چہرے پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں۔ اس قاعدہ میں الا ما ظہر منہا کے استثنار سے یہ آسانی پیدا کر دی گئی ہے کہ حقیقت میں جب چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اسکو کھول سکتی ہیں بشرطیکہ نمائش حسن مقصود نہ ہو"

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰: تفقہ کی بھی ضرورت ہے۔ ایک فقیہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ ستر اور حجاب میں کیا فرق ہے؟ اور اخفائے زینت اور ستر وجوہ کے درمیان کیا تفاوت ہے۔ ستر وہ چیز ہے جسکو شوہر کے سوا کسی کے سامنے بھی ظاہر کرنا جائز نہیں۔ مگر چہرے اور ہاتھ کی یہ نوعیت نہیں ہے، وہ محرموں کے سامنے کھلا رکھا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ستر کی اہمیت زیادہ ہے۔ اب زینت کو سجیے بن سنور کر غیروں کے سامنے آنا کسی حال میں بھی حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آسکتا۔ یہ صرف فاجرانہ ذہنیت ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ لہذا اسکے لیے نہی کے الفاظ استعمال فرمائے گئے (لا یبدین زینتھن الخ)، اور ہر شخص جو فقہ سے ذرا سا لگاؤ بھی رکھتا ہو، اس بات کو جانتا ہے کہ نہی بہ نسبت امر کے شدید تر چیز ہے۔ بخلاف اسکے عملی زندگی میں بسا اوقات چہرہ کھولنے کی حقیقی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ خدا کا قانون صرف خوشحال عورتوں ہی کے لیے نہیں ہے مصیبت زدہ، بے کس اور غریب طبقہ کی عورتوں کے لیے بھی ہے۔ وہ ان ماماؤں کے لیے بھی ہے جو دوسروں کے گھروں میں خدمت کرنے پر مجبور ہیں، ان مزدورنیوں کے لیے بھی ہے جو ہاتھ پاؤں کی محنت کر کے پیٹ پالنے پر مجبور ہیں، اُن غریبوں کی بیویوں اور بیٹیوں کے لیے بھی ہے جنکو سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانا میسر نہیں ہوتا اور جو کسی درخت کے سایہ ہی میں پڑ رہتے ہیں۔ ایسی عورتیں کہاں ہر وقت منہ چھپائے رہ سکتی ہیں؟ انہیں منہ کھولنے کی حقیقی ضرورت پیش آتی ہی ہے۔ اسی لیے شارع حکیم نے چہرے کے باب میں نہی کے الفاظ کے ساتھ حکم نہیں دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ چہرہ نہ کھولو، بلکہ امر کے الفاظ (یدنین علیھن الخ) استعمال کیے۔ اس سے یہ بات صاف مترشح ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں عام قاعدہ تو ستر و اخفا ہی کا ہے اگر حقیقی ضرورت پیش نہ ہو تو چھپانا لازم ہے، لیکن حقیقی ضرورت ہو تو ایک مومن عورت جو بدنیت نہیں ہے، خدا کا خوف رکھتی ہے، اپنے چہرے کے حسن کی نمائش اور غیر مردوں سے آنکھیں لڑانے کی خواہشمند نہیں ہے، اپنی ضرورت رفع کرنے کی حد تک کھول سکتی ہے، اور اس صورت میں مومن مردوں کا فرض ہے کہ غض بصر کریں۔ اسکی مثال میرے اپنے گھر میں موجود ہے۔ میرے ہاں جو حلال خوری ملازم ہے وہ ہمیشہ چہرے پر گھونگھٹ ڈال کر کام کرتی ہے۔ مگر بارہا اس بیچاری کو مجبور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲ پر دیکھیے)

یہ آپنے کہاں سے لکھ دیا کہ چہرہ پر گھونگٹ یا نقاب کے عام قاعدہ میں الا ما ظہر منہا کے استثنا سے آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ نقاب یا گھونگھٹ والی آیت سورۂ احزاب میں یوں ہے ۔

یاایھا النبی قل لازواجك وبناتك و — اے پیغمبر اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں
نساء المومنين يدنين عليهن من جلابيبهن — سے کہہ دو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے
ذالك ادنى ان يعرفن فلا يوذين ۔ — اقرب ہے کہ پہچان لی جائیں اور چھیڑی نہ جائیں۔

اس آیت میں جو حکم ہے وہ بالکل مطلق اور عام ہے۔ اس میں نہ تو کوئی قید ہے نہ استثناء۔ الا ماظہر منھا والا استثنا سورہ نور والی آیت میں ہے جو ابدا ر زینت سے متعلق ہے۔ ولا یبدین زینتھن الا ماظہر منہا۔ اسکو احزاب کی آیت سے دور قریب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مستثنیٰ منہ تو سورہ احزاب میں ہو اور مستثنیٰ سورہ نور میں۔ کشتی درچین و ملاح در فرنگ کی اس سے زیادہ دلچسپ مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ معاف فرمایئے گا، اگر مسائل فقھیہ کے استنباط و اجتہاد کی یہ انوکھی راہ باز ہو گئی تو اسکے نتائج نہایت خوفناک ہونگے۔

اور تھوڑی دیر کے لیے اگر آپ کے اس طفرہ کو ممکن بھی فرض کر لیا جائے اور سورۂ نور کے الا ماظہر کو سورہ احزاب کی آیت کے ساتھ جوڑ بھی دیا جائے جب بھی وہ مطلب کسی طرح نہیں نکل سکتا جو آپ نکالنا چاہتے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱ :- گھونگھٹ اٹھانا پڑتا ہے، اور میں ہمیشہ ایسے موقع پر غض بصر کرتا ہوں۔ اس کو میرے ہاں کام کرتے کئی مہینے ہو گئے ہیں، مگر آج تک میں نے اسکی صورت نہیں دیکھی حتی کہ اگر کہیں گھر سے باہر مجھے اس کو دیکھنے کا اتفاق ہو تو میں اسے پہچان نہیں سکتا۔

میں نے ہر موقع پر "حقیقی ضرورت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اور اسکی تصریح بھی اپنی کتاب میں کر چکا ہوں کہ حقیقی ضرورت سے مراد پارک میں ٹہلنے، یا سینما دیکھنے یا بازار میں شاپنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ ضرورت ہے جو ایک حاجتمند عورت کو فی الواقع اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے پیش آتی ہے جسکی چند مثالیں میں نے اوپر بیان کی ہیں۔ ا-م

ہیں۔ اس صورت میں آپکے خیال کے مطابق آیت یوں ہوگی۔ یاایھا النبی قل لازواجك وبناتك ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن الا ما ظھر منھا۔ اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنے چہروں پر اپنی چادروں کا ایک حصہ ڈال لیا کریں مگر جو حصہ اس میں سے ظاہر ہوجائے۔ یہاں ھا کی ضمیر سے متعلق جو نحوی تشقیقات پیدا ہونگی میں اُن سے غض بصر کرتا ہوں اور آپکے ساتھ زیادہ سے زیادہ مسامحت کے لیے تیار ہوں لیکن غور فرمایئے کہ اس صورت میں بھی اس کا مطلب کیا ہوگا؟ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عورتیں اپنی چادروں سے اپنے چہروں پر گھونگھٹ ڈال لیا کریں اور اس احتیاط کے باوجود بھی اگر چہرہ کا کوئی حصہ اتفاق سے کہیں جھلک گیا یا کھلا رہ گیا تو وہ چنداں قابل اعتراض نہیں۔ اس سے یہ آسانی کہاں سے پیدا ہوئی کہ اگر حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آجائے تو عورتیں اس کو کھول سکتی ہے؟ چہرہ کا کوئی حصہ اتفاق سے کھلا رہ جانا اور چیز ہے اور اسکو بلحاظ ضرورت کھولنا اور چیز ہے۔ ان دونوں کا نمایاں فرق آپ جیسے آدمی سے مخفی نہیں رہنا چاہیے اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ الا ما ظھر منھا کا یہ مطلب جو آپنے لیا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

آخر میں آپنے جو بات لکھی ہے، وہ پچھلے تمام عجائب پر بازی لے گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں "یہ پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے ان کا سد باب اس طرح کیا گیا کہ مردوں کو غض بصر کا حکم دیدیا گیا تاکہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجت کیلیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کرلیں اور بیہودگی کے ساتھ اس کو گھورنے سے باز رہیں" آپنے پہلے تو یہ کیا کہ سورۂ نور کا مستثنی کاٹ کر لائے اور اس کا قلم سورہ احزاب میں پیوند کیا۔ لیکن اسکے بعد بھی جب بات نہیں بنی تو سورہ نور کی آیت کے تمام بخیے اُدھیڑ ڈالے۔ سورہ نور کی آیت کی آسمانی ترتیب یوں ہے۔

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذلك ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون۔ وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا

ما ظہر منہا- لیکن آپ آیت کی ترتیب یوں کر دیتے ہیں ولا یبدین زینتھن الا ما ظہر منہا (فان ظہر منہا شیٔ) فقل للمومنین یغضوا من ابصارھم یعنی بے تکلف اصلی حکم کو فرع اور مقدم کو موخر کر دیتے ہیں- اگر اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے اس طرح آیات کی قلب ماہیت اور قرآن کی اصلاح جائز ہے تو دنیا کی کوئی غلط سے غلط بات بھی ثابت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی- میں حیران ہوں کہ آپ کا دل اس بیدردانہ تصرف پر راضی کیسے ہوا اور دماغ اس پر مطمئن کیسے ہو گیا!![1]

---

[1] معاف کیجیے گا، آپکی یہ ساری بحث پڑھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" لے زندگی کے حقیقی مسائل اور ان کے ساتھ احکام شریعت کے ربط و تعلق کو نظر انداز کر کے جب لوگ عبارات احکام کی لغوی اور صرفی و نحوی اناٹومی میں منہمک ہو جاتے ہیں تو اصول قانون اور روح قانون سے وہی بیگانگی رونما ہوتی ہے جسکا ثبوت آپنے اپنی اس بحث میں پیش کیا ہے- آپنے یہاں تین اعتراضات بیان فرمائے ہیں؛ (۱) سورۂ نور اور سورۂ احزاب میں جو احکام الگ الگ بیان ہوئے ہیں انکو ملا کر تو نے ایک کر دیا- (۲) الا ما ظہر کا استثنار جو ابدائے زینت کی نہی سے متعلق تھا اسے ادنائے جلباب کے امر سے متعلق کر دیا اور پھر غض بصر کے حکم کو یہاں لا کر چسپاں کیا- (۳) الا ما ظہر منہا میں خود بخود ظاہر ہو جانے والی زینت کے ظہور کو معاف کیا گیا تھا، مگر تو نے اس سے بضرورت چہرہ کھولنے کی اجازت نکال لی- آپکو ان تینوں باتوں پر سخت تعجب ہے مگر مجھے آپ کے تعجب پر تعجب ہے-

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو احکام زندگی کے کسی ایک شعبہ یا معاملہ سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ وہ کتنے ہی مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے ہوں، قانون مرتب کرنے کیلیے ہمیں ان سب کو ملا کر ایک مجموعہ بنانا پڑیگا- مثال کے طور پر دیکھیے سورۂ نساء میں بیاہی ہوئی عورتوں سے نکاح حرام قرار دیتے ہوئے صرف ان عورتوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو جنگ میں پکڑی ہوئی آئیں- اسکے معنی یہ ہیں کہ اور سب قسم کی محصنات حرام ہیں- لیکن دو سورتوں کے بعد سورۂ ممتحنہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان ان عورتوں سے بھی نکاح کر سکتے ہیں جو اپنے کافر شوہروں کو چھوڑ کر دار الکفر سے دار الاسلام میں آ جائیں- ایک فقیہ جب قانون مرتب کرنے بیٹھے گا تو اسے ان دونوں آیتوں کو یکجا کرنا ہوگا، مگر آپ پہلے تو اس پر کشتی درچین و ملاح درفرنگ کی پھبتی کسینگے اور پھر شاید آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہوگا کہ قرآن نے تو صرف الا ما ملکت ایمانکم کہا تھا اور تم اس پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۵ پر دیکھیے)

پھر یہ غور فرمائیے کہ عورت کا چہرہ کھولنے کے تمام ضروری اور ناگزیر مواقع، جو آپ نے بیان فرمائے ہیں، ایسے ہیں جن میں اسکے چہرہ کو نہ صرف آپ نے دیکھنے کی اجازت دی ہے بلکہ اس پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کا فتویٰ دیدیا ہے۔ مثلاً کوئی عورت کسی طبیب کے زیر علاج ہو، یا کسی مقدمہ میں قاضی کے سامنے بحیثیت گواہ یا بحیثیت فریق پیش ہو، یا اس کا منگیتر دیکھنا چاہے۔ اگر ان مواقع میں کسی عفت مآب نے حقیقی ضرورت سے چہرہ بے نقاب

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۴: ۔۔ والمومنٰت المہٰجرات کا فقرہ اپنی طرف سے اضافہ کر رہے ہو۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ میں اصحاب ظواہر کا پیرو نہیں ہوں کہ ایک حکم جن الفاظ کے ساتھ ایک خاص موقع پر آیا ہو اسکو اور اسکے الفاظ کو صرف اسی موقع کے لیے مخصوص سمجھوں۔ میرے نزدیک قیاس فی الشرع جائز ہے۔ میں حکم کی علت سمجھنے کی کوشش کرونگا اور جب علت میری سمجھ میں آجائیگی تو جہاں جہاں وہ علت پائی جائیگی وہاں حکم کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے جاری کرونگا۔ میری رائے یہ ہے کہ ابدار زینت سے منع کرنیکی وجہ محض اسکا موجب فتنہ ہونا ہے اور ادنائے جلباب کا حکم بھی اسی لیے دیا گیا ہے کہ چہرہ کھولنا فتنہ کا موجب ہے۔ اب اگر خود ظاہر ہو جانے کو پہلی صورت میں قابلِ معافی قرار دیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسری صورت میں بھی وہ قابلِ معافی نہ ہو۔

تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ میں اپنی نظر الّا ما ظہر منہا کے الفاظ تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اسکی حکمت بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ غور طلب سوال یہ ہے کہ ایک فتنہ انگیز چیز کے خود ظاہر ہونے کو آخر کیوں گوارا کر لیا گیا ہے؟ میرے نزدیک اسکی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ زینت کے خود ظاہر ہونے میں عورت کی طرف سے اظہار زینت کی خواہش نہیں ہوتی اسلیے وہ بری الذمہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صورت میں عدم اختیار پایا جاتا ہے جو قابلِ معافی ہے۔ یہی دو وجہیں مجھے اس صورت میں بھی نظر آتی ہیں جبکہ ایک عورت اپنی ضروریات زندگی کیلیے گھر سے باہر کام کرنے پر مجبور ہو اور اپنے کام کے سلسلے میں کسی وقت اسکو مجبوراً چہرہ کھولنا پڑے۔ اگر ایسی حالت میں وہ رفع ضرورت کیلیے، نہ کہ اپنی شکل دکھانے کی خاطر، مجبوراً چہرہ کھولتی ہے تو میرے نزدیک وہ اسی طرح قابلِ معافی ہے جس طرح زینت کے خود ظاہر ہونے کی صورت میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غض بصر کا حکم جن مواقع کیلیے دیا گیا ہے ان میں سے ایک موقع یہ بھی ہے۔ لیکن اگر آپ اس سے اختلاف رکھتے ہیں تو آپکو اختیار ہے کہ ایسی صورت جب پیش آئے تو غض بصر نہ کریں۔ ا ۔ م

کیا اور ڈاکٹر یا قاضی یا امیدوار نکاح نے بفحوائے یغضوا من ابصارھم نگاہیں نیچی کر لیں تو اس جلوہ نمائی کا فائدہ کیا؟ وہ تو اصل مقصد ہی فوت ہو گیا! اسکے علاوہ حقیقی ضرورت کی کوئی اور مثال آپ نے پیش نہیں کی ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں آپ کا یہ فتوئ غضِ بصر چلے گا یا نہیں ۔

اصل یہ ہے کہ سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی آیتوں میں پردے سے متعلق آپ نے جو احکام پائے ان میں آپ کو ایک قسم کا تخالف نظر آیا۔ سورۂ نور میں مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے غض بصر اور عدم ابدار زینت کا حکم ہے اور احزاب میں صاف صاف گھروں کے اندر خلوت گزیں رہنے اور باہر نکلتے وقت نقاب اور گھونگھٹ نکال لینے کا حکم ہے۔ علاوہ ازیں سورۂ نور میں ابدار زینت کی ممانعت کے ساتھ الا ماظہر منھا کا استثنا بھی تھا جس سے بعض مفسروں اور حنفی مجتہدوں نے چہرہ اور ہاتھ مراد لیا ہے اور سورۂ احزاب اس قسم کے قیود و مستثنیات سے خالی تھی ان کے علاوہ بعض اور مخصوصات بھی تھے مثلاً سورۂ نور میں صرف ضرب خمار ہے اور احزاب میں ادنائے جلباب۔ مگر اس سے آپ نے تعرض نہ کیا۔ اب ان مضطرب اور بظاہر متضاد باتوں میں آپکو تطبیق دینی تھی۔ پہلی مشکل یہ سامنے آئی کہ غضِ بصر اور نقاب ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ نقاب اور گھونگھٹ کی موجودگی میں غضِ بصر بالکل غیر ضروری ہے۔ پھر دوسری مشکل یہ پیش آئی کہ الا ماظہر منہا کی رو سے چہرہ (حسب تحقیق علمائے احناف) کھولا جا سکتا تھا اور حکم ادنائے جلابیب اس سے مانع تھا۔ ان ساری مشکلوں کو آپ نے یوں حل کیا کہ سورۂ احزاب کے ادنائے جلابیب کو آپ نے عورت کے لیے اصلی قاعدہ ٹھیرایا اور سورۂ نور کے الا ماظہر منہا کو اس کے اصلی مستثنیٰ منہ سے کاٹ کر لائے اور اس میں پیوند کر کے اسکو عند الضرورت چہرہ کھولنے سے متعلق قرار دیا۔ رہ گیا غضِ بصر کا حکم سو وہ حکم حجاب اور بعند الضرورت چہرہ کھولنے کی اجازت کے ساتھ کچھ غیر ضروری سا ہو رہا تھا تو آپ نے یہ پٹی ان آنکھوں پر باندھ دی جن سے اندیشہ تھا کہ عفت مآب خواتین کو گھور گھور کر دیکھینگی۔ باقی رہ گیا ضرب خمار کا معاملہ یا عورتوں کیلیے غضِ بصر کا حکم تو انکا نہ تو کوئی موزوں محل معلوم ہوا اور نہ آپکو ان سے تعرض کی چنداں ضرورت تھی۔ توفیق مختلفات کی اس عجیب و غریب محنت پر میں آپکو داد دیتا ہوں لیکن نتیجہ بحث سے نہ تو میں متفق ہوں اور نہ اس پر آپکو مبارک باد دے سکتا ہوں[1]۔

---

[1] توفیق مختلفات اور تطبیق متعارضات اہل مدرسہ کے مشاغل ہیں اور انہی کے مذاقِ بحث سے یہ چیز مناسبت رکھتی ہے۔
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۷ پر دیکھیے)

آپ نے الا ما ظہر منہا کے ٹکڑے پر محض بعض مفسرین اور صاحب احکام القرآن وغیرہ کے اقوال کی روشنی میں غور کیا۔ خود اپنے طور پر اسکے سیاق و سباق اور الفاظ و تالیف کی روشنی میں شائد غور نہیں فرمایا۔ ورنہ ایک بالکل غلط عمارت کی تعمیر میں آپ کی یہ ساری جد وجہد ضائع نہ جاتی۔ الا ما ظہر منہا مستثنیٰ ہے۔ اس کا مستثنیٰ منہ زینتھن ہے۔ زینت اور سامانِ زینت میں سے جو چیز علحدہ کی جائیگی وہ زینت اور سامانِ زینت کے قبیل سے ہوگی۔ ہاتھ اور چہرہ کیسے ہو سکتی ہے۔ چہرہ زینت نہیں ہے۔ وہ اعلیٰ ترین اور اشرف ترین حصہ جسم ہے۔ اسکو موضع زینت (جیسا کہ ابوبکر جصاص نے نکتہ آرائی فرمائی ہے) کی حیثیت سے بھی چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ وہ اپنی جمال آرائیوں کے لیے زیب و زینت کا محتاج کب ہے!

بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

اس بارہ میں صحیح مذہب وہی ابن مسعود اور حسن بصری رحمہما اللہ کا ہو سکتا ہے یعنی اس سے زینت لباس ظاہر مراد ہے۔ اس مذہب پر صاحب احکام القرآن نے جو ایراد کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں وقول ابن مسعود فی ان ما ظہر منہا ھو الثیاب لا معنی لہ لانہ معلوم انہ ذکر الزینۃ والمراد العضو الذی علیہ الزینۃ، الا تری ان ما سائر ما تتزین بہ من الحلی ۔۔۔۔ یجوز ان تظہرہ للرجال اذا لم تکن ھی لابسۃ۔ ابن مسعود جو اس سے زینت لباس ظاہر مراد لیتے ہیں، یہ بالکل بے معنی بات ہے۔ ہر چند استعمال لفظ زینت

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۶:۔ میرے سوچنے کا انداز یہ نہیں ہے۔ میں جب ایک طرف زندگی کے عملی مسائل کو اور دوسری طرف قانون کے احکام کو رکھکر دیکھتا ہوں تو مجھے اسلام میں کوئی تعارض نظر نہیں آتا کہ تطبیق کی کوشش کروں بلکہ مجھے ایک ایک عملی پہلو پر ایک ایک حکم صاف منطبق ہوتا نظر آتا ہے۔ تعارض اگر ہے تو احکام میں نہیں بلکہ ہماری اپنی زندگی کے مختلف حالات میں ہے

اور شارع نے صرف اتنا کیا ہے کہ تمام حالات میں انسان کو ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکا۔ ا۔م

ہوا ہے لیکن مراد اس سے وہ عضو ہے جس پر زینت ہوتی ہے۔ کیونکہ محض زینت دکھانے کی ممانعت کیوں ہوگی؟ اگر زیور عورت کے جسم پر نہ ہو تو وہ بے تکلف ہر مرد کو دکھا سکتی ہے"۔ لیکن ان نیک آدمی سے کوئی پوچھے کہ اسی آیت میں لیعلم ما یخفین من زینتھن میں زینت سے کیا مراد ہے؟ کیا پاؤں؟ اگر پاؤں مراد ہیں تو کیا ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن کے معنی یہ ہوں گے کہ عورتیں اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں کہ جو پاؤں وہ چھپائے ہوئے ہیں وہ ظاہر ہوں۔ کیا ابن مسعود رحمہ اللہ کی بات اگر بے معنی ہے تو قاضی صاحب کا یہ ارشاد کچھ بامعنی ہے[1]!

پھر یہ کس درجہ عجیب بات ہے کہ حکم یہ دیا جائے کہ مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور پھر اسی سے بالکل متصل یہ حکم دیا جائے کہ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں، الا ما ظہر منہا

---

[1] یہ تو بڑا ہی کمزور استدلال ہے۔ ایسا کمزور استدلال پیش کر کے تو قاضی ابوبکر کے بجائے خود آپ ہی "نیک آدمی" ثابت ہوگئے ہیں۔ آپ نے قاضی ابوبکر کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسلیے اعتراض بھی بغیر سمجھے بوجھے کر دیا۔ قاضی صاحب کا منشا یہ ہے کہ اظہار زینت کی ممانعت سے مقصود صنفی تحریک کو روکنا ہے، اور صنفی تحریک بجائے خود اُس سامان سے نہیں ہوتی جو زینت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ اس حالت میں ہوتی ہے جبکہ عورت اس سے مزین ہو۔ زیور یا خوش نما لباس اگر عورت کے جسم پر نہ ہو تو اسے دیکھ کر کسی کے جذبات بھی حرکت میں نہ آئینگے۔ لہٰذا شارع نے اظہار زینت کی جو ممانعت کی ہے اس سے مقصود نفس زینت کا اظہار نہیں بلکہ اس جسم یا حصۂ جسم کا اظہار ہے جو زینت سے مزین ہو۔ پھر اگر الا ما ظہر منہا کا استثنا، آراستہ و مزین ہونے کی حالت سے تعلق رکھتا ہے تو غیر مزین ہونے کی حالت میں محض سادہ جسم سے تو وہ بدرجۂ اولیٰ متعلق ہوگا۔ رہی آیت ولا یضربن بارجلھن الخ جسے آپ نے اعتراضاً پیش فرمایا ہے تو اس میں بھی حکم امتناعی کا مرجع بجائے خود پازیب، چھاجھن اور چوڑی کا وجود نہیں ہے بلکہ خود عورت کا وجود ہے جو ان چیزوں کو پہنے ہوئے ہو۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی آواز صرف اسی صورت میں محرک جذبات ہوتی ہے جبکہ کوئی عورت انہیں پہنے ہوئے چل رہی ہو، ورنہ بجائے خود ان چیزوں کی جھنکار میں کوئی شے موجب تحریک نہیں ہے۔ پس شارع کا منشا لیعلم ما یخفین من زینتھن کہنے سے یہ نہیں ہے کہ زمین پر پاؤں مارنے سے پازیب وغیرہ کے موجود ہونے کا علم ہو جائیگا، بلکہ مدعا یہ ہے کہ اس آواز کو سن کر پازیب والی کی طرف توجہات منعطف ہونگی اور سامعہ کے ذریعہ سے وہی اثرات مترتب ہونگے جو باصرہ کے ذریعہ سے عورت کو مزین دیکھ کر ہوتے۔ ا - م

"مگر جو ظاہر ہو جائے"، اور ابوبکر جصاص اور ان کے اصحاب عنوان ما ظہر منہا سے چہرہ اور ہاتھ کو مراد لے لیں۔ اگر چہرہ اور ہاتھ مستثنیٰ ہیں تو نگاہیں نیچی کرنے کی ضرورت (غض بصر) کا اصلی مقصود تو یہی ہو سکتا ہے کہ اجنبی نگاہیں چہروں سے ہٹ جائیں اور چہرہ ہی کو ان حضرات نے مستثنیٰ کر لیا۔

مقصد کے اعتبار سے بھی آپ کا مضمون کچھ بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ جن "تجدد نوازوں" یا "یرقان زدہ" کے مریضوں کو آپ نے اس میں مخاطب کیا ہے ان کے لیے آپ کی تمام حصار بندیوں کے باوجود کافی وسعت باقی ہے۔ ہندوستان کے تجدد نواز آپ کے اس فتوے پر قانع ہو جائیں گے کہ عند الضرورت چہرہ کھولنے کے باب میں شارع نے کوئی قطعی حکم نہیں دیا ہے۔ اس معاملہ میں تمام تر قاضی و مفتی خود عورت ہے۔ آپ نے اس منزل تک انکو پہنچا دیا۔ اب جو قیود چند بندرہ گئے ہیں ان کا فیصلہ انشاء اللہ زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی کشمکش اور نسوانی فقاہت کی مقراض تیز کر دے گی۔[1]

---

[1] کسی شخص کو ماخوذ کرنے کا یہ عجیب طریقہ ہے کہ اگر اسکی عبارت میں ثبوت جرم کی کافی گنجائش نہ ہو تو قطع و برید کر کے عبارت کو فرد قرار داد جرم کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ فاضل تنقید نگار نے دو جگہ مجھ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں استثنائی صورتوں میں مطلق عورت کو قاضی و مفتی قرار دیتا ہوں۔ حالانکہ خود انھوں نے میری عبارت سے جو فقرے نقل کیے ہیں ان میں یہ الفاظ موجود ہیں: "ایک مومن عورت جو خدا اور رسول کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جس کو فتنہ میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے" مطلق عورت اور مومن عورت میں جو عظیم الشان فرق ہے ایک صاحب علم آدمی اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس قید کو اطلاق سے بدل ڈالنا شائد اسلیے ضروری سمجھا گیا کہ اس تحریف کے بغیر الزام ثابت نہ ہو سکتا تھا۔

رہا یہ اندیشہ کہ بہانہ طلب منافقین میری تعبیر قانون سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے، تو میں اسکو قابل التفات نہیں سمجھتا۔ منافق کے لیے کون دروازہ بند کر سکتا ہے؟ وہ اس کا محتاج کب ہے کہ میں یا آپ یا کوئی اور شخص اسکے لیے راستہ کھولے۔ اسکے لیے تو ساری شریعت گنجائشوں سے بھری پڑی ہے۔ جدھر سے چاہے نکل بھاگے۔ وہ چاہے تو تمام عمر زکوٰۃ نہ
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰ پر دیکھیے)

یہ عریضہ میں نے محض اس اضطراب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے لکھا ہے جو آپ کے مضمون میں موجود ہے۔ باقی رہی اصل مسئلہ کی تحقیق، سورۂ احزاب اور سورۂ نور کے احکام کی تطبیق و توفیق اور ان کے موقع و محل کی تعین، قرآن مجید کی روشنی میں اسلامی پردہ کی نوعیت تو ان سوالات پر انشاء اللہ ایک مضمون ترجمان کے لیے جلد لکھوں گا۔ کوئی فقرہ قلم سے تیز نکل گیا ہو تو اسکی معافی چاہتا ہوں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹: دے، کبھی حج نہ کرے، کبھی روزہ نہ رکھے، ہر رات ایک نئی عورت سے نکاح کرے اور صبح طلاق دیدے۔ شریعت کی کونسی حد ہے جس سے نکلنے کا راستہ وہ نہ پا سکتا ہو؟ شریعت کا قانون دراصل اسکے لیے بنایا ہی نہیں گیا ہے۔ یہ تو صرف مومنوں کے لیے بنایا گیا ہے، اور اسی لیے منافقین کے واسطے اس میں ہر طرف راہِ فرار موجود ہے۔ اگر ہم قانون کی تعبیر کرتے ہوئے اس خوف کو پیش نظر رکھیں کہ کہیں منافق کو اس میں سے نکل بھاگنے کا راستہ نہ مل جائے، تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ ہم اپنی طرف سے قانون میں ان بندشوں کا اضافہ کریں جو شارع نے نہیں رکھی ہیں۔ اور یہ شریعت کی تعبیر نہیں تحریف ہوگی۔ ا - م

پردہ کے متعلق چند سوالات

["پردہ" پر جو سلسلہ ابھی "ترجمان القرآن" میں شائع ہوا ہے اسے دیکھ کر مولانا امین احسن صاحب کے علاوہ چند اور اصحاب نے بھی اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے ۔ یہاں انکو سلسلہ وار نقل کر کے مختصر جوابات درج کیے جاتے ہیں]

(۱)

آپ نے نماز باجماعت میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں جو روایات نقل کی ہیں انہیں دیکھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ آزادی نسواں کے حامی ایک نئی تحریک نہ شروع کر دیں کہ عورتوں کو شریعت نے تو مسجد میں حاضر ہونے اور نماز باجماعت میں شریک ہونے کی اجازت دی ہے مگر پرانے خیال کے لوگوں نے انہیں روک رکھا ہے، لہذا اب عورتوں کو مسجد ہی میں نماز پڑھنی چاہیے ۔ نیز آپ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کی خواتین کو ساتھ لے کر عیدگاہ تشریف لے جایا کرتے تھے ۔ کیا اس کا نتیجہ نہ ہوگا کہ ایک اور تحریک عیدگاہوں میں خواتین کے اجتماع کی اٹھے گی، برائے نام پردہ دار اور کھلم کھلا بے پردہ عورتوں کے جمگھٹے عیدگاہوں میں لگیںگے اور یاد خدا کے بجائے لوگ آنکھیں سینکنے اور نئے تعارف پیدا کرنے کے لیے وہاں جمع ہونگے؟ یہ محض خیالی اندیشہ نہیں ہے بلکہ اب سے دو سال قبل بمبئی میں انہی احادیث اور دلائل پر مولانا . . . . . صاحب نے نماز عید میں عورتوں کے اجتماع پر زور دیا، اور اس معاملہ میں حافظ . . . . . صاحب، جو ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر ہیں اور دس سال پہلے سے مسلمانان بمبئی میں بے پردگی کی بیماری پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کے ہمنوا ہوئے اور ان دونوں صاحبوں

کی کوشش سے ایک نئی عیدگاہ اہلحدیث قائم کی گئی جہاں خوب آراستہ و مزین ہو کر خواتین کرام نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے گئیں۔ اس حرکت کے جو کچھ اثرات ہوئے وہ ہماری یاد میں ابھی تازہ ہیں۔

آپ نے جنگ میں عورتوں کی شرکت اور نرسنگ کے متعلق جو روایات نقل کی ہیں وہ شائد احکام حجاب سے پہلے کی ہیں یا اس وقت کی ہیں جب مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ آج ان روایات کو پیش کرنیکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ ان سے اپنے خیالات کی تائید میں استدلال کرینگے جنکے نزدیک تیمار داری اور مرہم پٹی کے لیے جوان و خوبصورت نرسوں کی سب سے زیادہ ضرورت اسلیے ہے کہ ان سے جذبات قلبی کو تسکین ہوتی ہے اور شفا پانے میں مدد ملتی ہے۔

نیاز مند

یوسف حاجی مکی۔ از بمبئی

جواب

جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کے متعلق پہلے یہ امر ذہن نشین کر لیجیے کہ دنیوی قوانین کے برعکس دینی قانون صرف ان لوگوں کے لیے بنایا جاتا ہے جو اہل ایمان ہوں اور جنکے اندر اس کے احکام کی اطاعت کا اندرونی جذبہ موجود ہو۔ ورنہ جو لوگ ضد اور عناد رکھتے ہوں اور جنہیں دینی قانون کے مقاصد ہی سے اتفاق نہ ہو، ان کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس دین کے اندر ہی رہیں جنکے احکام کے مقصد و مدعا سے انہیں اتفاق نہیں ہے۔ قانون کے الفاظ سے فائدہ اٹھا کر مقصد قانون کے خلاف کام کرنے کی گنجائش نکال لینے کی ضرورت تو صرف دنیوی قوانین کے معاملہ میں پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض حکومت کے خارجی دباؤ سے انسانوں پر مسلط کیے جاتے ہیں۔ رہا دینی قانون تو اس کے معاملہ میں اسکی کیا حاجت ہے۔ جو اس کے احکام کی اسپرٹ کو قبول نہ کرنا چاہے اسکے لیے پورا موقع ہے کہ اس دین کو ماننے سے انکار کر دے۔

مسجد میں عورتوں کے جانے کے متعلق جو احادیث میں نے نقل کی ہیں اور انکی جو تشریحات

کی ہیں انہیں آپ پھر پڑھیں - ان میں یہ بات صاف موجود ہے کہ عورتوں کا وہاں جانا پسندیدہ نہیں ہے اور ناجائز بھی نہیں - اگر نہ جائیں تو بہتر ہے - اگر جانا چاہیں تو روکا نہ جائے - اور یہ منع نہ کرنیکا حکم بھی اس صورت میں ہے جبکہ عورتیں چند شرائط کی پابندی کریں ، یعنی بن ٹھن کر اور خوشبو لگا کر نہ جائیں ، ایسے زیورات نہ پہنیں جنکی آواز ہو ، صرف صبح اور عشاء کے وقت جائیں ، مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑی ہوں اور امام کے سلام پھیرتے ہی اٹھ جائیں - ان باتوں کو ملحوظ رکھ کر غور کیجیے کہ آزادی نسواں کا وہ حامی کس قدر بے ایمان ہوگا جو "عورتوں کو مسجد ہی میں نماز پڑھنی چاہیے" کا دعویٰ لے کر اٹھے گا اور اس کے لیے جہاد کرے گا۔

عیدگاہ میں عورتوں کے جانے کے متعلق آپنے جو سوال کیا ہے اسکی بھی وہی نوعیت ہے جو پہلے سوال کی ہے - سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ پردہ دار سادہ اور غیر مزین خواتین کا عیدگاہ میں جانا اور مردوں کے مجمع سے الگ جمع ہونا ہے - اور آپ سوال کر رہے ہیں "برائے نام پردہ دار اور کھلم کھلا بے پردہ عورتوں کے عیدگاہ میں جمع ہونے" کے متعلق - جو لوگ وانتم سکاریٰ کو چھوڑ کر صرف لاتقربوا الصلوٰۃ کے حکم کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان سے تو یہی عرض کیا جائیگا کہ آپ کو آخر عمل بالقرآن کی حاجت ہی کیا پیش آئی ہے -

جنگ میں عورتوں کی شرکت صرف ابتدائے اسلام ہی میں نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر عہد تک اور خلفائے راشدین کے دور میں بھی ثابت ہے لہذا جو استدلال آپ فرما رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے - البتہ یہ بات صاف ہے کہ خدمات جنگ میں عورتوں کے حصہ لینے کی غرض اور کیفیت اسلامی نقطۂ نظر سے اس نوعیت کی نہیں ہے جو مغربی نقطۂ نظر سے ہے - آپ میری عبارات کو پھر پڑھیں - میں نے صرف واقعات ہی نہیں بیان کیے ہیں بلکہ ان واقعات میں قانون کی جو اسپرٹ پائی جاتی ہے اسکی بھی تشریح کر دی ہے -

اس سلسلہ میں ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ جب آدمی کو قانون کے اصول اور ضوابط بیان کرنے ہوں تو اس کا فرض ہے کہ جو کچھ اصل مآخذ سے ثابت ہو اُسے بے کم و کاست بیان کر دے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ افراط یا تفریط پسند کرنے والوں کی غلط تعبیرات کے خوف سے اصل قانون ہی میں کتر بیونت کرنے لگے۔ میں نے جو کچھ قرآن اور حدیث میں پایا ہے اور جو کچھ اس سے سمجھا ہے اسے جوں کا توں رکھ دیا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس قانون کی اسپرٹ کیا ہے، اس کے مقاصد کیا ہیں، اس کے حدود میں کمی اور بیشی کس اصول پر ہوتی ہے۔ ان باتوں کے بیان کرنے میں میں نے انتہا پسند مخالفین پردہ اور انتہا پسند حامیان پردہ، دونوں کو نظر انداز کر کے اصل قانون جیسا کچھ ہے اسی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کے بعض اجزاء کو چھوڑ کر بعض اجزاء الگ کر کے نکال لے اور حسب منشا ان سے نتائج نکالنے لگے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

(۲)

آپ کے ان حالیہ جامع مضامین کے مطالعہ کا مجھکو شرف حاصل رہا ہے جن میں جناب نے پردہ اور نکاح وسفاح پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ دوران مطالعہ میرے ذہن ناقص میں چند شبہات ناشی ہوئے ہیں جن کا میں بغرض استفسار نہ کہ بطور اعتراض جناب کے سامنے ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ امید کہ جناب کا جواب میرے طمانیت قلب کا باعث ہوگا۔

۱۔ جہاں کہیں احتمالِ فتنہ تھا عورتوں کو غضِّ بصر، کتم ستر و زینت کے احکام دیے گئے ہیں۔ لیکن عورتوں کو ان کے غلاموں کے سامنے اظہار زینت کی اجازت کیوں دیگئی ہے؟ غلاموں کے سامنے اظہار زینت ایک عظیم فتنہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ باپ، بھائی اور بیٹے کے برعکس عورتوں کو بعد عتاق اپنے غلاموں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے لہٰذا مذکورالصدر رشتہ داروں کے برعکس غلام بعد عتاق نامحرم ہو جاتے ہیں۔

۲- حُرّہ اور امۃ کے ستر میں فرق رکھا گیا ہے حالانکہ باعتبار ساخت جسمانی اور صنفی جذبات ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح ایک آزاد عورت کی عریانی باعث فتن ہوسکتی ہے اُسی طرح ایک لونڈی کی عریانی بھی فتنہ کا موجب بن سکتی ہے۔

۳- اگر لونڈیوں کا ستر کام کاج میں سہولت پیدا کرنے کے لیے آزاد عورتوں کے ستر سے مختلف رکھا گیا ہے تو کیا اس دور میں جبکہ شرعی لونڈیوں کا وجود اس صفحۂ ہستی پر مفقود ہے ماماؤں کو باغراض سہولت لونڈیوں کا ستر اختیار کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

۴- اسلام میں مغنیات اور شریف عورتوں کے لباس میں فرق بتلایا گیا ہے کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ دور رسالتؐ اور عہد راشدہ میں مملکت اسلامی میں مغنیات جیسے رذیل طبقہ کا وجود روا رکھا گیا تھا۔

۵- ہر مرد کو بوقت واحد چار عورتیں نکاح میں رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن لونڈیوں کی صورت میں تعداد کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دے کر ذہنی آوارگی کا انسداد کیا گیا ہے، لونڈیوں کی اَن گنت تعداد سے تمتع کی اجازت دیکر ذہنی آوارگی کا باب کیوں وا کیا گیا ہے؟ خصوصاً لونڈیوں کے قابل بیع وشریٰ ہونے سے شبہات تقویت پاتے ہیں۔

حبیب اللہ فاروقی - حیدرآباد - دکن

جواب

(۱) شریعت زندگی کے صرف ایک پہلو کو نہیں دیکھتی بلکہ تمام پہلوؤں پر یکساں نگاہ رکھتی ہے۔ اخلاق کی حفاظت اور فتنوں کا استیصال ہی اسکے پیش نظر نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر ہے کہ معاشرت کا دائرہ انسان کے لیے تنگ نہ ہو جائے۔ غلام اور خادم معاشرت کے جزء ہوتے ہیں۔

ان سے خانگی کام کاج میں رات دن سابقہ پیش آتا ہے - اخفائے زینت کا اتنا اہتمام عورتوں کے لیے غیر ممکن ہے کہ جن لوگوں سے ہر وقت کا سابقہ ہو ان سے بھی اخفا کر سکیں - پھر یہ لوگ طبعاً اپنے آقاؤں سے اس قدر دبے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان سے فتنہ کا احتمال بہت ہی کم ہوتا ہے - اسی لیے اللہ تعالیٰ نے گھر کے مردوں کے ساتھ ساتھ غلاموں اور تابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال کو بھی اخفائے زینت کے حکم سے مستثنیٰ کیا ہے - یہ استثنار عام حالات کے لیے ہے - البتہ اگر کوئی صاحب خانہ کسی خاص غلام یا تابع مرد کے حالات کو مناسب نہ پائے تو یہ بات اسکے اختیار تمیزی پر ہے کہ اسکو استثنا سے خارج کر دے - مرد کو خانگی زندگی میں قوّام کا منصب دیا ہی اسی لیے گیا ہے کہ وہ انفرادی حالات میں قانون کے منشا کو پورا کرنے کے لیے جو تدبیر مناسب سمجھے اختیار کرے -

(۲) آزاد عورت اور لونڈی کے ستر میں جو فرق رکھا گیا ہے وہ بھی انہی اسباب سے ہے جو اوپر بیان ہوئے - ستر کے حدود کو کم کرنے کے معنی عریانی کے نہیں ہیں - صرف اتنا حصۂ جسم کھولنے کی اجازت لونڈی کو دی گئی ہے جتنا خانگی فرائض انجام دینے کے لیے ضروری ہے - مثلاً آٹا گوندھنے کے لیے اسکو ایک حد تک اپنی باہیں کھولنی ہی پڑینگی - یا گھر کا فرش دھونے کے لیے اپنے پائینچے کسی حد تک ٹخنوں سے اٹھانے ہی پڑینگے - مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ضرورۃً جن حصوں کو کھولنے کی اجازت دی گئی ہے انہیں عادۃً کھلا ہی رکھا جائے، یا قصداً حد ضرورت سے زیادہ کھولا جائے -

(۳) جو ضرورتیں لونڈیوں سے تعلق رکھتی ہیں وہی خدمت پیشہ عورتوں سے بھی متعلق ہیں اسلیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لیے بھی شریعت میں وہی سہولت ہے جو لونڈیوں کے لیے ہے - لیکن ان کو بھی یہی ہدایت کرنی چاہیے کہ بے حیا عورتوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کریں - یہ سہولت ان کو ضروریات پوری کرنے کے لیے دی گئی ہے نہ اس لیے کہ وہ شرم و غیرت کے لباس سے عاری ہو کر گھروں میں فتنے برپا کریں - ان باتوں کی نگرانی گھر کے مالک اور اسکی ملکہ کے فرائض میں سے ہے -

(۴) قاضی بیضاوی کے جس فقرے سے آپکو یہ شبہ ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغنیات کا طبقہ اسلامی معاشرت کا جزء ہے اور اسلام نے اس طبقہ کو بحیثیت ایک جزء و معاشرت کے تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں مغنیات جس قسم کے لباس پہنتی تھیں یا غیر مسلم معاشرت میں اس طبقہ کی عورتیں جو لباس پہنتی ہیں، اسلام اپنی پیرو خواتین کو اُس سے روکنا چاہتا ہے۔ اسلام اسکو گوارا نہیں کرتا کہ مسلمان عورت اُس ہیئت میں منظر عام پر پیش ہو جس میں بیسوا عورتیں اور ایکٹرسیں نمودار ہوا کرتی ہیں۔

(۵) آپکا یہ سوال تفصیل طلب ہے۔ جمادی الاولیٰ ۵۴ھ کے "ترجمان القرآن" میں اس پر ایک مستقل مضمون لکھ چکا ہوں۔ یہ مضمون انشاء اللہ عنقریب "تفہیمات" حصہ دوم میں آپ کو مل جائیگا۔ یہاں مختصراً صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ لونڈیوں سے تمتع کی اجازت جن تمدنی مصالح کی بنا پر دی گئی ہے وہ تعداد کے تعین سے فوت ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا تعین نہیں کیا جاسکتا کہ کس زمانہ اور کس لڑائی میں کتنی عورتیں سبایا کی حیثیت سے دار الاسلام میں آئینگی اور ایک خاص وقت میں مسلمان آبادی کے اندر سبایا کا تناسب کس قدر ہوگا۔ اب تمتع کی اجازت دینے کا مقصد ہی عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کے تمدنی خطرات کا سدباب ہے، تو آپ خود غور کیجیے کہ اضافہ کی مقدار کے معین نہ ہونے کی صورت میں تمتع کی حد کا تعین کس طرح کیا جاسکتا تھا۔ جس حکیم نے یہ قانون بنایا ہے وہ یک چشم نہیں ہے کہ ایک وقت میں معاملہ کے ایک ہی رخ کو دیکھ سکتا ہو۔ اسکی حاوی نگاہ بیک وقت تمام پہلوؤں پر پڑتی ہے، اسی لیے اس سے وضع قانون میں وہ بے اعتدالی صادر نہیں ہوتی جسکے صادر نہ ہونے کی شکایت انسان نے اکثر اس سے کی ہے۔

رہا آپ کا یہ شبہ کہ لونڈیوں کی اَن گنت تعداد سے تمتع کرنے کی اجازت ذہنی آوارگی کا دروازہ کھولتی ہے، اور یہ کہ لونڈیوں کے قابل بیع و شریٰ ہونے کی وجہ سے اس کا امکان ہے کہ مالدار لوگ لونڈیاں

خرید خرید کر عورتوں کا ایک پورا بیڑہ فراہم کریں اور اپنے گھروں کو عیاشی کا اڈا بنا کر رکھ دیں، تو یہ اور اس نوعیت کے اکثر شبہات عموماً اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ معاملہ کا ایک ہی پہلو نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرے پہلو چھپے رہتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ شارع نے اپنا قانون انسان کی بھلائی کے لیے بنایا ہے اور اس قانون میں جو سہولتیں اور گنجائشیں رکھی ہیں وہ اُن حقیقی ضرورتوں کے لیے رکھی ہیں جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں یا پیش آسکتی ہیں۔ اگر بعض لوگ ان گنجائشوں سے وہ غلط فائدہ اٹھاتے ہیں جس کے لیے دراصل شارع نے یہ گنجائشیں نہیں رکھی تھیں، تو یہ ان کی اپنی نافہمی ہے یا شرارت نفس۔ لیکن اس قسم کی انفرادی غلطیوں کے امکان یا وقوع سے ڈر کر قانون میں ایسی تنگی پیدا کرنا جس سے عام لوگوں کی حقیقی ضرورتیں پوری ہونے میں مشکلات واقع ہوں، کسی حکیم کا کام نہیں ہو سکتا۔ شارع نے لونڈیوں کی غیر محدود تعداد سے تمتع کی اجازت اس لیے نہیں دی ہے کہ ایک ایک مسلمان اپنے گھر میں راجہ اندر بن جائے اور بے شمار عورتوں کے جھرمٹ میں بس رات دن داد عیش ہی دیتا رہے، بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر غیر معمولی حالات پیش آجانے کی وجہ سے سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد یکایک بہت بڑھ جائے تو اس کو آسانی کے ساتھ ٹھکانے لگایا جا سکے۔ اس غرض کے لیے کئی صورتیں رکھی گئی ہیں، مثلاً لونڈیوں کے نکاح غلاموں سے کر دیے جائیں، لونڈیوں کے نکاح غریب طبقہ کے آزاد مردوں سے کر دیے جائیں، لونڈیوں کو آزاد کر کے خود مالک ان سے نکاح کر لیں، اور انہیں صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ مالک آزاد کیے بغیر ہی ان سے تمتع کریں۔ اسی طرح لونڈیوں کی بیع و شریٰ کو جائز کرنے کا مقصد بھی یہ نہیں ہے کہ آوارہ مزاج لوگ محض عیاشی کی خاطر بہت سی لونڈیاں خرید خرید کر جمع کر لیا کریں، اور جب دل بھر جائے تو انہیں بیچ کر دوسرا بیڑہ بھرتی کر لیں۔ بلکہ دراصل یہ سہولت ان ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر دی گئی ہے جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں، مثلاً ایک شخص مفلس ہو گیا ہے اور لونڈی غلام رکھنے کی استطاعت اس میں نہیں رہی ہے، یا اسکے پاس ضرورت سے زیادہ لونڈی غلام جمع ہو گئے ہیں، یا ان

میں سے کسی کو وہ پسند نہیں کرتا - کیا ان حقیقی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے محض اس خوف سے قانون کا دائرہ تنگ کرنا درست ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ ان سہولتوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے؟ ایسی خباثتوں کے امکانات تو خود نکاح و طلاق کے قانون میں بھی ہیں۔ اگر کوئی شریر آدمی "جائز زنا کاری" پر اتر آئے تو وہ روز ایک نئی عورت سے چند روپوں پر نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے کر کسی دوسری عورت کو تلاش کر سکتا ہے۔ پھر کیا ایسی انفرادی شرارتوں کے خوف سے یہ صحیح ہوگا کہ طلاق اور نکاح کے قانون میں ایسی بندشیں بڑھادی جائیں جن سے عام لوگوں کی زندگی تنگ ہو جائے؟

خطبہ

سلامتی کا راستہ

[یہ خطبہ ریاست کپورتھلہ میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے ایک مشترک اجتماع کے سامنے عرض کیا گیا تھا]

ہستی باری

صاحبو! اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ بازار میں ایک دوکان ایسی ہے جس کا کوئی دوکاندار نہیں ہے، نہ کوئی اس میں مال لانے والا ہے نہ بیچنے والا اور نہ کوئی اسکی رکھوالی کرتا ہے، دوکان خود بخود چل رہی ہے، خود بخود اس میں مال آجاتا ہے اور خود بخود خریداروں کے ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے، تو کیا آپ اس شخص کی بات مان لینگے؟ کیا آپ تسلیم کر لینگے کہ کسی دوکان میں مال لانے والے کے بغیر خود بخود بھی مال آسکتا ہے، مال بیچنے والے کے بغیر خود بخود فروخت بھی ہو سکتا ہے، حفاظت کرنے والے کے بغیر خود بخود چوری اور لوٹ سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے؟ اپنے دل سے پوچھیے، ایسی بات آپ کبھی مان سکتے ہیں؟ جسکے ہوش حواس ٹھکانے سے ہوں کیا اسکی عقل میں یہ بات کبھی آسکتی ہے کہ کوئی دوکان دنیا میں ایسی بھی ہوگی؟

فرض کیجیے، ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ اس شہر میں ایک کارخانہ ہے جس کا نہ کوئی مالک ہے، نہ انجینیر، نہ مستری، سارا کارخانہ خود بخود قائم ہو گیا ہے، ساری مشینیں خود ہی بن بھی گئیں، خود ہی سارے پرزے اپنی اپنی جگہ لگ بھی گئے، خود ہی سب مشینیں چل بھی رہی ہیں، اور خود ہی ان میں سے عجیب عجیب چیزیں بن بن کر نکل بھی رہی ہیں۔ سچ بتائیے، جو شخص آپ سے یہ بات کہے گا، آپ حیرت

سے اس کا منہ نہ تکنے لگینگے؟ آپکو یہ شبہ نہ ہوگا کہ اس کا دماغ کہیں خراب تو نہیں ہوگیا ہے؟ کیا ایک پاگل کے سوا ایسی بیہودہ بات کوئی کہہ سکتا ہے؟

دور کی مثالوں کو چھوڑیے۔ یہ بجلی کا بلب جو آپ کے سامنے جل رہا ہے، کیا کسی کے کہنے سے آپ یہ مان سکتے ہیں کہ روشنی اس بلب میں آپ سے آپ پیدا ہوجاتی ہے؟ یہ کرسی جو آپ کے سامنے رکھی ہے، کیا کسی بڑے سے بڑے فاضل فلسفی کے کہنے سے بھی آپ یہ باور کرسکتے ہیں کہ یہ خود بخود بن گئی ہے؟ یہ کپڑے جو آپ پہنے ہوئے ہیں، کیا کسی علامۂ دہر کے کہنے سے بھی آپ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوجائینگے کہ ان کو کسی نے بُنا نہیں ہے، یہ خود ہی بُن گئے ہیں؟ یہ گھر جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں، اگر تمام دنیا کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر مل کر بھی آپ کو یقین دلانا چاہیں کہ ان گھروں کو کسی نے نہیں بنایا ہے بلکہ یہ خود بن گئے ہیں، تو کیا اُن کے یقین دلانے سے آپ کو ایسی لغو بات پر یقین آجائیگا؟

یہ چند مثالیں آپ کے سامنے کی ہیں۔ رات دن جن چیزوں کو آپ دیکھتے ہیں انہی میں سے چند ایک میں نے بیان کی ہیں۔ اب غور کیجیے، ایک معمولی دوکان کے متعلق جب آپ کی عقل یہ نہیں مان سکتی کہ وہ کسی دوکان دار کے بغیر قائم ہوگی اور چلتی رہیگی تو اتنی بڑی دنیا کے متعلق کس طرح آپ کی عقل یہ باور کرسکتی ہے کہ وہ کسی قائم کرنے والے کے بغیر قائم ہوگئی اور کسی چلانے والے کے بغیر چل رہی ہے؟ جب ایک ذرا سے کارخانے کے متعلق آپ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوسکتے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر بن جائیگا اور کسی چلانے والے کے بغیر چلتا رہیگا تو یہ زمین و آسمان کا زبردست کارخانہ جو آپ کے سامنے چل رہا ہے، جس میں چاند اور سورج اور بڑے بڑے ستارے گھڑی کے پرزوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں، جس میں سمندروں سے بھاپیں اٹھتی ہیں، بھاپوں سے بادل بنتے ہیں، بادلوں کو ہوائیں اڑا کر زمین کے کونے کونے میں پھیلاتی ہیں، پھر ان کو مناسب وقت پر ٹھنڈک پہنچا کر دوبارہ بھاپ سے پانی بنایا جاتا ہے، پھر وہ پانی بارش کے قطروں کی صورت میں زمین پر گرایا جاتا ہے، پھر اس بارش

کی بدولت مردہ زمین کے پیٹ سے طرح طرح کے لہلہاتے ہوئے درخت نکالے جاتے ہیں، قسم قسم کے غلّے، رنگ برنگ کے پھل اور وضع وضع کے پھول پیدا کیے جاتے ہیں، اس کارخانے کے متعلق آپ یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کسی بنانے والے کے بغیر خود بن گیا اور کسی چلانے والے کے بغیر خود چل رہا ہے؟ ایک ذراسی کرسی ایک گز بھر کپڑے، ایک چھوٹی سی دیوار کے متعلق کوئی کہہ دے کہ یہ چیزیں خود بنی ہیں تو آپ فوراً فیصلہ کر دینگے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے، پھر بھلا اُس شخص کے دماغ کی خرابی میں کیا شک ہو سکتا ہے جو کہتا ہے کہ زمین خود بن گئی، جانور خود پیدا ہو گئے، انسان جیسی حیرت انگیز چیز آپ سے آپ بن کر کھڑی ہو گئی؟

آدمی کا جسم جن اجزاء سے مل کر بنا ہے اُن سب کو سائنس دانوں نے الگ الگ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ لوہا ہے، کچھ کوئلہ، کچھ گندھک، کچھ فاسفورس، کچھ کیلسیم، کچھ نمک، چند گیسیں اور بس ایسی ہی چند اور چیزیں جن کی مجموعی قیمت چند روپوں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ چیزیں جتنے جتنے وزن کیساتھ آدمی کے جسم میں شامل ہیں، اتنے ہی وزن کے ساتھ لے لیجیے اور جس طرح جی چاہے ملا کر دیکھ لیجیے۔ آدمی کسی ترکیب سے نہ بن سکیگا۔ پھر کس طرح آپ کی عقل یہ مان سکتی ہے کہ ان چند بے جان چیزوں سے دیکھتا، سنتا، بولتا، چلتا پھرتا انسان، وہ انسان جو ہوائی جہاز اور ریڈیو بناتا ہے، کسی کاریگر کی حکمت کے بغیر خود بخود بن جاتا ہے؟

کبھی آپ نے غور کیا کہ ماں کے پیٹ کی چھوٹی سی فیکٹری میں کس طرح آدمی تیار ہوتا ہے؟ باپ کی کارستانی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ ماں کی حکمت کا اس میں کوئی کام نہیں۔ ایک ذراسی تھیلی میں دو کیڑے جو خوردبین کے بغیر دیکھے تک نہیں جا سکتے، نہ معلوم کب آپس میں مل جاتے ہیں، ماں کے خون ہی سے ان کو غذا پہنچنی شروع ہوتی ہے، وہی لوہا، گندھک، فاسفورس وغیرہ تمام چیزیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ایک خاص وزن اور خاص نسبت کے ساتھ وہاں جمع ہو کر لوتھڑا بنتی ہیں، پھر اس لوتھڑے میں جہاں آنکھیں بنی چاہییں وہاں آنکھیں بنتی ہیں، جہاں کان بننے چاہئیں وہاں کان بنتے ہیں،

جہاں دماغ بننا چاہیے وہاں دماغ بنتا ہے، جہاں دل بننا چاہیے وہاں دل بنتا ہے، ہڈی اپنی جگہ پر، گوشت اپنی جگہ پر، رگیں اپنی جگہ پر، خون اپنی جگہ پر، غرض ایک ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتا ہے، پھر اس میں جان پڑتی ہے، دیکھنے کی طاقت، سننے کی طاقت، چکھنے اور سونگھنے کی طاقت، بولنے کی طاقت، سوچنے اور سمجھنے کی طاقت، اور کتنی ہی بے حد و حساب طاقتیں اس میں بھر جاتی ہیں۔ اس طرح جب انسان مکمل ہو جاتا ہے تو پیٹ کی وہی چھوٹی سی فیکٹری جہاں نو مہینے تک وہ بن رہا تھا خود زور کر کے اسے باہر دھکیل دیتی ہے۔ اور دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ اس فیکٹری میں ایک ہی طریقہ سے لاکھوں انسان روز بنکر نکل رہے ہیں مگر ہر ایک کا نمونہ جدا ہے، شکل جدا، رنگ جدا، آواز جدا، قوتیں اور قابلیتیں جدا، طبیعتیں اور خیالات جدا، اخلاق اور صفات جدا، غرض ایک ہی پیٹ سے نکلے ہوئے دو سگے بھائی تک ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ یہ ایسا کرشمہ ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کرشمے کو دیکھ کر بھی جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کام کسی زبردست حکمت والے، زبردست قدرت والے، زبردست علم اور بے نظیر کمالات رکھنے والے خدا کے بغیر ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے، یقیناً اس کا دماغ درست نہیں ہے۔ اس کو عقلمند سمجھنا عقل کی توہین کرنا ہے کم از کم میں تو ایسے شخص کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی معقول مسئلہ پر اس سے گفتگو کروں۔

توحید

اچھا اب ذرا اور آگے چلیے۔ آپ میں سے ہر شخص کی عقل اس بات کی گواہی دیگی کہ دنیا میں کوئی کام بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کبھی باضابطگی و باقاعدگی سے نہیں چل سکتا جب تک کہ کوئی ایک شخص اس کا ذمہ دار نہ ہو۔ ایک مدرسے کے دو ہیڈ ماسٹر، ایک محکمہ کے دو ڈائرکٹر، ایک فوج کے دو سپہ سالار، ایک سلطنت کے دو رئیس یا بادشاہ کبھی آپ نے سنے ہیں؟ اور اگر کہیں ایسا ہو تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک دن کیلیے بھی انتظام ٹھیک ہو سکتا ہے؟ آپ اپنی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں بھی اس کا تجربہ

کرتے ہیں کہ جہاں ایک کام کو ایک سے زیادہ آدمیوں کی ذمہ داری پر چھوڑا جاتا ہے وہاں سخت بد انتظامی ہوتی ہے، لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، اور آخر ساجھے کی ہنڈیا ایک دن چوراہے میں پھوٹ کر رہتی ہے۔ انتظام، باقاعدگی، ہمواری اور خوش اسلوبی دنیا میں جہاں بھی آپ دیکھتے ہیں وہاں لازمی طور پر کوئی ایک طاقت کارفرما ہوتی ہے، کوئی ایک ہی وجود بااختیار و اقتدار ہوتا ہے، اور کسی ایک ہی کے ہاتھ میں سررشتۂ کار ہوتا ہے۔ اسکے بغیر انتظام کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔

یہ ایسی سیدھی بات ہے کہ کوئی شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو اسے ماننے میں تامل نہ کریگا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر ذرا اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈالیے۔ یہ زبردست کائنات جو آپ کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، یہ کروروں سیارے جو آپ کو اوپر گردش کرتے نظر آتے ہیں، یہ زمین جس پر آپ رہتے ہیں، یہ چاند جو راتوں کو نکلتا ہے، یہ سورج جو ہر روز طلوع ہوتا ہے، یہ زہرہ، یہ مریخ، یہ عطارد، یہ مشتری، اور یہ دوسرے بے شمار تارے جو گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں، دیکھیے! ان سب کے گھومنے میں کیسی سخت باقاعدگی ہے۔ کبھی رات اپنے وقت سے پہلے آتی ہوئی آپنے دیکھی؟ کبھی دن اپنے وقت سے پہلے نکلا؟ کبھی چاند زمین سے ٹکرایا؟ کبھی سورج اپنا راستہ چھوڑ کر ہٹا؟ کبھی کسی اور ستارے کو آپنے ایک بال برابر بھی اپنی گردش کی راہ سے ہٹتے ہوئے دیکھا یا سنا؟ یہ کرورہا سیارے جن میں سے بعض ہماری زمین سے لاکھوں گنے بڑے ہیں اور بعض سورج سے بھی ہزاروں گنے بڑے، یہ سب گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک زبردست ضابطہ میں کسے ہوئے ہیں اور ایک بندھے ہوئے حساب کے مطابق اپنی اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنے اپنے مقرر راستہ پر چل رہے ہیں۔ نہ کسی کی رفتار میں ذرہ برابر فرق آتا ہے، نہ کوئی اپنے راستہ سے بال برابر ٹل سکتا ہے۔ ان کے درمیان جو نسبتیں قائم کر دی گئی ہیں، اگر ان میں ایک پل کے لیے ذرا سا فرق بھی آجائے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے جس طرح ریلیں ٹکراتی ہیں اس طرح سیارے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔

یہ تو آسمان کی باتیں ہیں۔ ذرا اپنی زمین اور خود اپنی ذات پر نظر ڈال کر دیکھیے۔ اس مٹی کی گیند پر یہ سارا زندگی کا کھیل جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب چند بندھے ہوئے ضابطوں کی بدولت قائم ہے۔ زمین کی کشش نے ساری چیزوں کو اپنے حلقے میں باندھ رکھا ہے۔ ایک سکنڈ کے لیے بھی اگر وہ اپنی گرفت چھوڑ دے تو سارا کارخانہ بکھر جائے۔ اس کارخانہ میں جتنے کل پرزے کام کر رہے ہیں سب کے سب ایک قاعدے کے پابند ہیں اور اس قاعدے میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ہوا اپنے قاعدے کی پابندی کر رہی ہے، پانی اپنے قاعدے میں بندھا ہوا ہے، روشنی کے لیے جو قاعدہ ہے اسکی وہ مطیع ہے، گرمی اور سردی کے لیے جو ضابطہ ہے اسکی وہ غلام ہے، مٹی، پتھر، دھاتیں، بجلی، اسٹیم، درخت، جانور کسی میں یہ مجال نہیں کہ اپنی حد سے بڑھ جائے یا اپنی خاصیتوں کو بدل دے یا اس کام کو چھوڑ دے جو اسکے سپرد کیا گیا ہے۔

پھر اپنی اپنی حد کے اندر اپنے اپنے ضابطہ کی پابندی کرنے کے ساتھ اس کارخانے کے سارے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں، اور دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ یہ ساری چیزیں اور ساری قوتیں مل کر کام کر رہی ہیں۔ ایک ذرا سے بیج کی ہی مثال لے لیجیے جس کو آپ زمین میں بوتے ہیں۔ وہ کبھی پرورش پا کر درخت بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ زمین اور آسمان کی ساری قوتیں مل کر اسکی پرورش میں حصہ نہ لیں۔ زمین اپنے خزانوں سے اسکو غذا دیتی ہے، سورج اسکی ضرورت کے مطابق اسے گرمی پہنچاتا ہے، پانی سے جو کچھ وہ مانگتا ہے وہ پانی دیدیتا ہے، ہوا سے جو کچھ وہ طلب کرتا ہے وہ ہوا دیدیتی ہے، راتیں اسے ٹھنڈک اور اوس بہم پہنچاتی ہیں، دن اسے گرما کر پختگی کی طرف لے جاتے ہیں، اس طرح مہینوں اور برسوں تک مسلسل ایک باقاعدگی کے ساتھ یہ سب مل جل کر اسے پالتے پوستے ہیں، تب جا کر کہیں درخت بنتا ہے اور اس میں پھل آتے ہیں۔ آپ کی یہ ساری فصلیں جنکے بل بوتے پر آپ جی رہے ہیں، انہی بے شمار

مختلف قوتوں کے بالاتفاق کام کرنے ہی کی وجہ سے تیار ہوتی ہیں۔ بلکہ آپ خود زندہ اسی وجہ سے ہیں کہ زمین اور آسمان کی تمام طاقتیں متفقہ طور پر آپ کی پرورش میں لگی ہوئی ہیں۔ اگر تنہا ایک ہوا ہی اس متفقہ کاروبار سے الگ ہوجائے تو آپ ختم ہوجائیں۔ اگر پانی ہوا اور گرمی کے ساتھ موافقت کرنے سے انکار کردے تو آپ پر بارش کا ایک قطرہ نہ برس سکے۔ اگر مٹی پانی کے ساتھ اتفاق کرنا چھوڑ دے تو آپ کے باغ سوکھ جائیں، آپکی کھیتیاں کبھی نہ پکیں اور آپ کے مکان کبھی نہ بن سکیں۔ اگر دیا سلائی کی رگڑ سے آگ پیدا ہونے پر راضی نہ ہو تو آپ کے چولھے ٹھنڈے ہوجائیں اور آپ کے سارے کارخانے ایک لخت بیٹھ جائیں۔ اگر لوہا آگ کے ساتھ تعلق رکھنے سے انکار کردے تو آپ ریلیں اور موٹریں تو درکنار ایک چھری اور ایک سوئی تک نہ بنا سکیں۔ غرض یہ ساری دنیا جس میں آپ جی رہے ہیں یہ صرف اس وجہ سے قائم ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے سارے محکمے پوری باقاعدگی کے ساتھ، پوری پابندی کے ساتھ، پورے انتظام کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر کام کر رہے ہیں اور کسی محکمے کے کسی اہل کار کی یہ مجال نہیں ہے کہ اپنی ڈیوٹی سے ہٹ جائے یا ضابطہ کے مطابق دوسرے محکموں کے اہل کاروں سے اشتراک عمل نہ کرے۔

یہ جو کچھ میں نے آپ سے بیان کیا ہے، کیا اس میں کوئی بات جھوٹ یا خلاف واقعہ ہے؟ شائد آپ میں سے کوئی بھی اسے جھوٹ نہ کہے گا۔ اچھا، اگر یہ سچ ہے تو مجھے بتایئے کہ یہ زبردست انتظام، یہ حیرت انگیز باقاعدگی، یہ کمال درجہ کی ہمواری، یہ زمین و آسمان کی بے حد و حساب چیزوں اور طاقتوں میں کامل موافقت آخر کس وجہ سے ہے؟ کروڑوں برس سے یہ کائنات یونہی قائم چلی آرہی ہے، لکھوکھا سال سے اس زمین پر درخت اُگ رہے ہیں، جانور پیدا ہورہے ہیں، اور نہ معلوم کب سے انسان اس زمین پر جی رہا ہے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ چاند زمین پر گر جاتا، یا زمین سورج سے جا ٹکراتی۔ کبھی رات اور دن کے حساب میں فرق نہ آیا۔ کبھی ہوا کے محکمہ کی پانی کے محکمہ سے لڑائی نہ ہوئی۔ کبھی پانی مٹی

سے نہ روٹھا۔ کبھی گرمی نے آگ سے رشتہ نہ توڑا۔ آخر اس سلطنت کے تمام صوبے، تمام محکمے، تمام ہرکارے اور کارندے کیوں اس طرح قانون اور ضابطے کی پابندی کیے چلے جارہے ہیں؟ کیوں ان میں لڑائی نہیں ہوتی؟ کیوں فساد برپا نہیں ہوتا؟ کس چیز کی وجہ سے یہ سب ایک انتظام میں بندھے ہوئے ہیں؟ اس کا جواب اپنے دل سے پوچھیے۔ کیا وہ گواہی نہیں دیتا کہ ایک ہی خدا اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے، ایک ہی کا فرمان سب پر چل رہا ہے، ایک ہی ہے جس کی زبردست طاقت نے سب کو اپنے ضابطے میں باندھ رکھا ہے؟ اگر وس بیس نہیں، دو خدا بھی اس کائنات کے مالک ہوتے تو یہ انتظام اس باقاعدگی کے ساتھ کبھی نہ چل سکتا۔ ایک ذرا سے مدرسے کا انتظام تو دو ہیڈ ماسٹروں کی ہیڈ ماسٹری برداشت نہیں کرسکتا، پھر بھلا اتنی بڑی زمین و آسمان کی سلطنت دو خداؤں کی خدائی میں کیسے چل سکتی تھی؟

پس واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ دنیا کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنی ہے، بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو　ایک ہی نے بنایا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس دنیا کا انتظام کسی حاکم کے بغیر نہیں چل رہا ہے، بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حاکم ایک ہی ہے۔ انتظام کی باقاعدگی صاف کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک کے سوا کسی کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات نہیں ہیں۔ ضابطہ کی پابندی منہ سے بول رہی ہے کہ اس سلطنت میں ایک حاکم کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ قانون کی سخت گیری شہادت دے رہی ہے کہ ایک بادشاہ کی حکومت زمین سے آسمان تک قائم ہے، چاند سورج اور سیارے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، زمین اپنی تمام چیزوں کے ساتھ اسی کی تابع فرمان ہے، ہوا اسی کی غلام ہے، پانی اسی کا بندہ ہے، دریا اور پہاڑ اسی کے محکوم ہیں، درخت اور جانور اسی کے مطیع ہیں، انسان کا جینا اور مرنا اسی کے اختیار میں ہے، اسکی مضبوط گرفت نے سب کو پوری قوت کے ساتھ جکڑ رکھا ہے اور کوئی اتنا زور نہیں رکھتا کہ اسکی حکومت میں اپنا حکم چلا سکے۔ درحقیقت اس مکمل تنظیم میں ایک سے زیادہ حاکموں کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تنظیم کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ حکم میں ایک شمّہ برابر بھی کوئی اس کا حصہ دار نہ ہو، تنہا وہی حاکم ہو اور اس کے سوا

سب محکوم ہوں، کیونکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں فرمانروائی کے ادنیٰ سے اختیارات ہونے کے معنی بھی بدنظمی و فساد کے ہیں۔ حکم چلانے کے لیے صرف طاقت ہی درکار نہیں ہے، علم بھی درکار ہے، اتنی وسیع نظر درکار ہے کہ تمام کائنات کو بیک وقت دیکھ سکے اور اسکی مصلحتوں کو سمجھ کر احکام جاری کر سکے۔ اگر خداوند عالم کے سوا کچھ چھوٹے چھوٹے خدا ایسے ہوتے جو نگاہ جہاں بین تو نہ رکھتے، لیکن انہیں دنیا کے کسی حصے یا کسی معاملہ میں اپنا حکم چلانے کا اختیار حاصل ہوتا تو یہ زمین و آسمان کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی ایسے شخص کو اس میں دخل اندازی کا اختیار دے دیا جائے جو اس سے پوری طرح واقف نہ ہو تو وہ اسے بگاڑ کر رکھ دیگا۔ لہٰذا عقل یہ فیصلہ کرتی ہے، اور زمین و آسمان کے نظام سلطنت کا انتہائی باضابطگی کے ساتھ چلنا اسکی گواہی دیتا ہے کہ اس سلطنت کے اختیارات شاہی میں ایک خدا کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی حصہ نہیں ہے۔

یہ صرف ایک واقعہ ہی نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ خدا کی خدائی میں خود خدا کے سوا کسی کا حکم چلنے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ جن کو اس نے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے، جو اس کے مخلوق ہیں، جنکی ہستی اسکی عنایت سے قائم ہے، جو اس سے بے نیاز ہو کر خود اپنے بل بوتے پر ایک لمحہ کیلیے بھی موجود نہیں رہ سکتے، ان میں سے کسی کی یہ حیثیت کب ہو سکتی ہے کہ خدائی میں اس کا حصہ دار بن جائے؟ کیا کسی نوکر کو آپ نے ملکیت میں آقا کا شریک ہوتے دیکھا ہے؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ کوئی مالک اپنے غلام کو اپنا ساجھی بنالے؟ کیا خود آپ میں سے کوئی شخص اپنے ملازموں میں سے کسی کو اپنی جائداد میں یا اپنے اختیارات میں حصہ دار بناتا ہے؟ اس بات پر جب آپ غور کرینگے تو آپ کا دل گواہی دیگا کہ خدا کی اس سلطنت میں کسی بندے کو خود مختارانہ فرمانروائی کا کوئی حق حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسا ہونا نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے، نہ صرف عقل اور فطرت کے خلاف ہے، بلکہ حق کے خلاف بھی ہے۔

انسان کی تباہی کا اصلی سبب

صاحبو! یہ وہ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر اس دنیا کا پورا نظام چل رہا ہے۔ آپ اس دنیا سے الگ نہیں ہیں، بلکہ اس کے اندر اس کے ایک جزء کی حیثیت سے رہتے ہیں، لہٰذا آپ کی زندگی کے لیے بھی یہ حقیقتیں اسی طرح بنیادی ہیں جس طرح کل جہان کے لیے ہیں۔

آج یہ سوال آپ میں سے ہر شخص کے لیے اور دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ایک پریشان کن گتھی بنا ہوا ہے کہ آخر ہم انسانوں کی زندگی سے امن چین کیوں رخصت ہو گیا ہے؟ کیوں آئے دن یہ مصیبتیں ہم پر نازل ہو رہی ہیں؟ کیوں ہماری زندگی کی کل بگڑ گئی ہے؟ قومیں قوموں سے ٹکرا رہی ہیں۔ ملک ملک میں کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ آدمی آدمی کے لیے بھیڑیا بن گیا ہے۔ لاکھوں انسان لڑائیوں میں برباد ہو رہے ہیں۔ کروڑوں اور اربوں کے کاروبار غارت ہو رہے ہیں۔ بستیوں کی بستیاں اجڑ رہی ہیں۔ طاقت ور کمزوروں کو کھائے جاتے ہیں۔ مال دار غریبوں کو لوٹے لیتے ہیں۔ حکومت میں ظلم ہے۔ عدالت میں بے بے انصافی ہے۔ دولت میں بدمستی ہے۔ اقتدار میں غرور ہے۔ دوستی میں بے وفائی ہے۔ امانت میں خیانت ہے۔ اخلاق میں راستی نہیں رہی۔ انسان پر سے انسان کا اعتماد اٹھ گیا۔ مذہب کے جامہ میں لامذہبی ہو رہی ہے۔ آدم کے بچے لاتعداد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو دغا، ظلم، بے ایمانی، ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچانا کارِ ثواب سمجھ رہا ہے۔ یہ ساری خرابیاں آخر کس وجہ سے ہیں؟ خدا کی خدائی میں اور جس طرف بھی ہم دیکھتے ہیں امن ہی امن نظر آتا ہے۔ ستاروں میں امن ہے ہوا میں امن ہے۔ پانی میں امن ہے۔ درختوں اور جانوروں میں امن ہے۔ تمام مخلوقات کا انتظام پورے امن کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہیں فساد یا بدنظمی کا نشان نہیں پایا جاتا۔ مگر ایک انسان ہی کی زندگی کیوں اس نعمت سے محروم ہو گئی؟

یہ ایک بڑا سوال ہے جسے حل کرنے میں لوگوں کو سخت پریشانی پیش آ رہی ہے۔ مگر میں پورے

اطمینان کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہتا ہوں - میرے پاس اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کو حقیقت اور واقعہ کے خلاف بنا دیا ہے اسلیے وہ تکلیف اٹھا رہا ہے اور جب تک وہ پھر اسے حقیقت کے مطابق نہ بنائیگا کبھی چین نہ پا سکیگا - آپ چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ بیٹھیں اور اسے کھول کر بے تکلف اس طرح باہر نکل آئیں جیسے اپنے مکان کے صحن میں قدم رکھ رہے ہیں، تو آپ کی اس غلط فہمی سے نہ ریل کا دروازہ گھر کا دروازہ بن جائیگا اور نہ وہ میدان جہاں آپ گرینگے آپ کے گھر کا صحن ثابت ہوگا - آپکے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت ذرا بھی نہ بدلیگی - تیز دوڑتی ہوئی ریل کے دروازے سے جب آپ باہر تشریف لائینگے تو اس کا جو نتیجہ ظاہر ہونا ہے وہ ظاہر ہو کر ہی رہے گا، خواہ ٹانگ ٹوٹنے اور سر پھٹنے کے بعد بھی آپ یہ تسلیم نہ کریں کہ آپنے جو کچھ سمجھا تھا غلط تھا - بالکل اسی طرح اگر آپ سمجھ بیٹھیں کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، یا آپ خود اپنے خدا بن بیٹھیں، یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان لیں، تو آپکے ایسا سمجھنے یا مان لینے سے حقیقت ہرگز نہ بدلیگی - خدا خدا ہی رہے گا - اس کی زبردست سلطنت، جس میں آپ محض رعیت کی حیثیت سے رہتے ہیں، پورے اختیارات کے ساتھ اسی کے قبضہ میں رہے گی - البتہ آپ اپنی غلط فہمی کی وجہ سے جو طرز زندگی اختیار کرینگے اس کا نہایت برا خمیازہ خود آپ کو بھگتنا پڑے گا، خواہ آپ تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی اپنی اس غلط زندگی کو بجائے خود صحیح ہی سمجھتے رہیں -

پہلے جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں اسے ذرا اپنی یاد میں پھر تازہ کر لیجیے - خداوند عالم کسی کے بنانے سے خداوند عالم نہیں بنا ہے - وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ آپ اس کی خدائی مانیں تو وہ خدا ہو - آپ خواہ مانیں یا نہ مانیں وہ تو خود خدا ہے - اسکی خدائی خود اپنے زور پر قائم ہے - اس نے آپ کو اور اس دنیا کو خود بنایا ہے - یہ زمین، یہ چاند اور سورج اور یہ ساری کائنات اسکے حکم کی تابع ہے - اس کائنات میں جتنی قوتیں کام کر رہی ہیں سب اسکے زیر حکم ہیں - وہ ساری چیزیں جنکے بل پر آپ

زندہ ہیں، اسکے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ خود آپ کا اپنا وجود اس کے اختیار میں ہے۔ اس واقعہ کو آپ کسی طرح بدل نہیں سکتے۔ آپ اس کو نہ مانیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اس سے آنکھیں بند کرلیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اسکے سوا کچھ اور سمجھ بیٹھیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ ان سب صورتوں میں واقعہ کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا، البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ اس واقعہ کو تسلیم کرکے اپنی وہی حیثیت قبول کریں جو اس واقعہ کے اندر دراصل آپ کی ہے تو آپ کی زندگی درست ہوگی، آپ کو چین ملیگا، امن ملیگا، اطمینان نصیب ہوگا، اور آپ کی زندگی کی ساری کل ٹھیک چلیگی۔ اور اگر آپ نے واقعہ کے خلاف کوئی اور حیثیت اختیار کی تو انجام وہی ہوگا جو چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ کر قدم باہر نکالنے کا ہوتا ہے۔ چوٹ آپ خود کھائینگے۔ ٹانگ آپ کی ٹوٹیگی۔ سر آپ کا پھٹیگا۔ تکلیف آپ کو پہنچیگی۔ واقعہ جیسا تھا ویسا ہی رہیگا۔

آپ سوال کرینگے کہ اس واقعہ کے مطابق ہماری صحیح حیثیت کیا ہے۔ میں چند لفظوں میں اس کی تشریح کردیتا ہوں۔ اگر کسی نوکر کو آپ تنخواہ دیکر پال رہے ہوں تو بتائیے اس نوکر کی اصلی حیثیت کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ آپ کی نوکری بجالائے، آپ کے حکم کی اطاعت کرے، آپ کی مرضی کے مطابق کام کرے اور نوکری کی حد سے نہ بڑھے۔ نوکر کا کام آخر نوکری کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ آپ اگر افسر ہوں اور کوئی آپ کا ماتحت ہو تو ماتحت کا کام کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ ماتحتی کرے، افسری کی ہوا میں نہ رہے۔ آپ کسی جائداد کے مالک ہوں تو اس جائداد میں آپ کی خواہش کیا ہوگی؟ یہی نا کہ اس میں آپ کی مرضی چلے جو کچھ آپ چاہیں وہی اس میں ہو اور آپ کی مرضی کے خلاف پتہ نہ ہل سکے۔ آپ پر اگر کوئی بادشاہی مسلط ہو اور تمام قوتیں اس کے ہاتھ میں ہوں تو ایسی بادشاہی کی موجودگی میں آپ کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے؟ یہی نا کہ آپ سیدھی طرح رعیت بن کر رہنا قبول کریں اور شاہی قانون کی فرمانبرداری سے قدم باہر نہ نکالیں۔ بادشاہ کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے اگر آپ خود اپنی بادشاہی کا دعویٰ کرینگے یا کسی دوسرے

کی بادشاہی مان کر اسکے حکم پر چلینگے تو آپ باغی ہونگے اور باغی کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

ان مثالوں سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ خدا کی اس سلطنت میں آپکی اصلی حیثیت کیا ہے۔ آپکو اس نے بنایا ہے۔ قدرتی طور پر آپ کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ اپنے بنانے والے کی مرضی پر چلیں۔ آپ کو وہ پال رہا ہے اور اسی کے خزانے سے آپ تنخواہ لے رہے ہیں۔ آپکی کوئی حیثیت اسکے سوا نہیں ہے کہ آپ اسکے نوکر ہیں۔ آپکا اور ساری دنیا کا افسر وہ ہے۔ اسکی افسری میں آپ کی حیثیت ماتحتی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ زمین اور آسمان سب اسکی جائداد ہیں۔ اس جائداد میں اسی کی مرضی چلیگی اور اسی کی چلنی چاہیے۔ آپ کو یہاں اپنی مرضی چلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اپنی مرضی آپ چلانے کی کوشش کرینگے تو منہ کی کھائینگے۔ اس سلطنت میں اسکی بادشاہی اسکے اپنے زور پر قائم ہے۔ زمین اور آسمان کے سارے محکمے اسکے قبضہ میں ہیں، اور آپ خواہ راضی ہوں یا نہ ہوں، بہرحال خود بخود آپ اس کی رعیت ہیں۔ آپ کی اور کسی انسان کی بھی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی دوسری حیثیت رعیت ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اسی کا قانون اس سلطنت میں قانون ہے اور اسی کا حکم حکم ہے۔ رعیت میں سے کسی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ میں ہز مجسٹی ہوں، یا ہز ہائی نس ہوں، یا ڈکٹیٹر اور مختار کل ہوں۔ نہ کسی شخص یا پارلیمنٹ یا اسمبلی یا کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس سلطنت میں خدا کے بجائے خود اپنا قانون بنائے اور خدا کی رعیت سے کہے کہ ہمارے اس قانون کی پیروی کرو۔ نہ کسی انسانی حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ خدا کے حکم سے بے نیاز ہو کر خدا کے بندوں پر خود اپنا حکم چلائے اور ان سے کہے کہ ہمارے اس حکم کی اطاعت کرو۔ نہ کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کے لیے یہ جائز ہے کہ اصلی بادشاہ کی رعیت بننے کے بجائے بادشاہی کے جھوٹے مدعیوں میں سے کسی کی رعیت بننا قبول کرے، اصلی بادشاہ کے قانون کو چھوڑ کر جھوٹے قانون سازوں کا قانون تسلیم کرے، اور اصلی حکمراں سے منہ موڑ کر جھوٹ موٹ کی ان حکومتوں کا حکم ماننے لگے۔

یہ تمام صورتیں بغاوت کی ہیں۔ بادشاہی کے اختیارات کا دعویٰ کرنا اور ایسے دعوے کو قبول کرنا، دونوں حرکتیں رعیت کے لیے بغاوت کا حکم رکھتی ہیں۔ اور اس بغاوت کی سزا ان دونوں کو ملنی یقینی ہے خواہ جلدی ملے یا دیر میں۔

آپ کی اور ایک ایک انسان کی پیشانی کے بال خدا کی مٹھی میں ہیں۔ جب چاہے پکڑ کر گھسیٹ لے۔ زمین اور آسمان کی اس سلطنت سے بھاگ جانے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ آپ اس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتے۔ مٹی میں مل کر آپ کا ایک ایک ذرہ بھی اگر منتشر ہو جائے، آگ میں جل کر خواہ آپ کی راکھ ہوا میں پھیل جائے، پانی میں بہ کر خواہ آپ مچھلیوں کی غذا بنیں یا سمندر کے پانی میں گھل جائیں، ہر جگہ سے خدا آپ کو پکڑ بلائیگا۔ ہوا اس کی غلام ہے۔ زمین اس کی بندی ہے۔ پانی اور اس کی مچھلیاں سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ ایک اشارے پر سب طرف سے آپ پکڑے ہوئے آجائینگے، اور پھر وہ آپ میں سے ایک ایک کو بلا کر پوچھے گا کہ میری رعیت ہو کر بادشاہی کا دعویٰ کرنے کا حق تمہیں کہاں سے پہنچ گیا تھا؟ میرے ملک میں اپنا حکم چلانے کے اختیارات تم کہاں سے لائے تھے؟ میری سلطنت میں اپنا قانون جاری کرنے والے تم کون تھے؟ میرے بندے ہو کر دوسروں کی بندگی کرنے پر تم کیسے راضی ہو گئے؟ میرے نوکر ہو کر تم نے دوسروں کا حکم مانا، مجھ سے تنخواہ لے کر دوسروں کو ان داتا اور رازق سمجھا، میرے غلام ہو کر دوسروں کی غلامی کی، میری بادشاہی میں رہتے ہوئے دوسروں کی شاہی مانی، دوسروں کے قانون کو قانون سمجھا اور دوسروں کے فرامین کی اطاعت کی۔ یہ بغاوت کس طرح تمہارے لیے جائز ہو گئی تھی؟ فرمائیے، آپ میں سے کس کے پاس اس الزام کا جواب ہے؟ کون سی وکیل صاحب وہاں اپنے قانونی داؤ پیچ سے بچاؤ کی صورت نکال سکیں گے؟ اور کونسی سفارش پر آپ بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو اس بغاوت کے جرم کی سزا بھگتنے سے بچالیگی؟

ظلم کی وجہ

ماجو! یہاں صرف حق ہی کا سوال نہیں ہے۔ یہ سوال بھی ہے کہ خدا کی اس خدائی میں کیا کوئی انسان بادشاہی یا قانون سازی یا حکمرانی کا اہل ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی اناڑی شخص جو اسکی مشینری سے واقف نہ ہو اسے چلائیگا تو اسکو بگاڑ دیگا۔ ذرا کسی ناواقف آدمی سے ایک موٹر ہی چلوا کر دیکھ لیجیے۔ ابھی آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس حماقت کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اب خود سوچیے کہ وہ ہے کہ ایک مشین کا حال جب یہ ہے کہ صحیح علم کے بغیر اسکو استعمال نہیں کیا جاسکتا تو انسان جس کے نفسیات انتہا درجہ کے پیچیدہ ہیں، جسکی زندگی کے معاملات بے شمار پہلو رکھتے ہیں اور ہر پہلو میں لاکھوں گتھیاں ہیں، اسکی پیچ در پیچ مشینری کو وہ لوگ کیا چلا سکتے ہیں جو دوسروں کو جاننا اور سمجھنا تو درکنار خود اپنے آپ کو بھی اچھی طرح نہیں جانتے نہیں سمجھتے۔ ایسے اناڑی جب قانون ساز بن بیٹھینگے اور ایسے نادان جب انسانی زندگی کی ڈرائیوری کرنے پر آمادہ ہونگے تو کیا اس کا انجام کسی اناڑی شخص کے موٹر چلانے کے انجام سے کچھ بھی مختلف ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا بنایا ہوا قانون مانا جا رہا ہے اور جہاں خدا کی اطاعت سے بے نیاز ہو کر انسان حکم چلا رہے ہیں اور انسان اُن کا حکم مان رہے ہیں، وہاں کسی جگہ بھی امن نہیں ہے، کسی جگہ بھی آدمی کو چین نصیب نہیں، کسی جگہ بھی انسانی زندگی کی کل سیدھی نہیں چلتی۔ کشت و خون ہو رہے ہیں، ظلم اور بے انصافی ہو رہی ہے، لوٹ کھسوٹ برپا ہے، آدمی کا آدمی خون چوس رہا ہے، انسانوں کے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں، صحتیں برباد ہو رہی ہیں، تمام طاقتیں جو خدا نے انسان کو دی تھیں، انسان کے فائدے کے بجائے اسکی تباہی اور بربادی میں صرف ہو رہی ہیں۔ یہ مستقل دوزخ جو اس دنیا میں انسان نے اپنے لیے آپ اپنے ہاتھوں بنالی ہے اسکی کوئی وجہ اسکے سوا نہیں ہے کہ اس نے بچوں کی طرح شوق میں آکر اُس مشین کو چلانے کی کوشش کی جسکے کل پرزوں سے وہ واقف ہی نہیں۔ اس مشین کو جس نے بنایا ہے وہی اسکے رازوں کو جانتا ہے، وہی اسکی فطرت سے واقفیت رکھتا ہے، اسی کو

ٹھیک ٹھیک معلوم ہے کہ یہ کس طرح صحیح چل سکتی ہے۔ اگر آدمی اپنی حماقت سے باز آجائے اور اپنی جہالت تسلیم کرکے اُس قانون کی پابندی کرنے لگے جو خود اس مشین کے بنانے والے نے مقرر کیا ہے، تب تو جو کچھ بگڑا ہے وہ پھر بن سکتا ہے، ورنہ ان مصیبتوں کا کوئی حل ممکن نہیں ہے۔

بے انصافی کیوں ہے؟

آپ ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں تو آپ کو جہالت کے سوا اپنی زندگی کے بگاڑ کی ایک اور وجہ بھی نظر آئیگی۔ ذرا سی عقل یہ بات سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ انسان کسی ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کا نام نہیں ہے۔ تمام دنیا کے انسان بہرحال انسان ہیں۔ تمام انسانوں کو جینے کا حق ہے۔ سب اس کے حقدار ہیں کہ انکی ضرورتیں پوری ہوں۔ سب امن کے، انصاف کے، عزت اور شرافت کے مستحق ہیں۔ انسانی خوشحالی اگر کسی چیز کا نام ہے تو وہ کسی ایک شخص یا خاندان یا قوم کی خوشحالی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی خوشحالی ہے۔ ورنہ ایک خوشحال ہو اور دس بدحال ہوں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان خوشحال ہے۔ فلاح اگر کسی چیز کو کہتے ہیں تو وہ تمام انسانوں کی فلاح ہے نہ کہ کسی ایک طبقہ کی یا ایک قوم کی۔ ایک کی فلاح اور دس کی بربادی کو آپ انسانی فلاح نہیں کہہ سکتے۔ اس بات کو اگر آپ صحیح سمجھتے ہیں تو غور کیجیے کہ انسانی فلاح اور خوشحالی کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اسکی کوئی صورت اسکے سوا نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کے لیے قانون وہ بنائے جسکی نظر میں تمام انسان یکساں ہوں۔ سب کے حقوق انصاف کے ساتھ وہ مقرر کرے جو نہ تو خود اپنی کوئی ذاتی غرض رکھتا ہو اور نہ کسی خاندان یا طبقہ کی یا کسی ملک یا قوم کی اغراض سے وابستہ ہو۔ سب کے سب حکم اُس کا مانیں جو حکم دینے میں نہ اپنی جہالت کی وجہ سے غلطی کرے، نہ اپنی خواہش نفس کی بنا پر حکمرانی کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور نہ ایک کا دشمن اور دوسرے کا دوست، ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف، ایک کی طرف مائل اور دوسرے سے منحرف ہو۔ صرف اسی صورت میں عدل قائم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح تمام انسانوں، تمام قوموں

تمام طبقوں اور تمام گروہوں کو ان کے جائز حقوق پہنچ سکتے ہیں، اور یہی ایک صورت ہے جس سے ظلم مٹ سکتا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی انسان بھی ایسا بے لاگ، ایسا غیر جانبدار، ایسا بے غرض، اور اس قدر انسانی کمزوریوں سے بالاتر ہو سکتا ہے؟ شائد آپ میں سے کوئی شخص میرے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کریگا۔ یہ شان صرف خدا ہی کی ہے۔ کوئی دوسرا اس شان کا نہیں ہے۔ انسان خواہ کتنے ہی بڑے دل گردے کا ہو، بہرحال وہ اپنی کچھ ذاتی اغراض رکھتا ہے، کچھ دلچسپیاں رکھتا ہے، کسی سے اس کا تعلق زیادہ ہے اور کسی سے کم، کسی سے محبت ہے اور کسی سے نہیں ہے، کسی سے اس کو وابستگی ہے اور کسی سے نہیں ہے۔ ان کمزوریوں سے کوئی انسان پاک نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا قانون مانا جاتا ہے اور خدا کے بجائے انسانوں کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہے وہاں کسی نہ کسی صورت میں ظلم اور بے انصافی ضرور موجود ہے۔

اِن شاہی خاندانوں کو دیکھیے جو زبردستی اپنی طاقت کے بل بوتے پر امتیازی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے وہ عزت، وہ ٹھاٹھ، وہ آمدنی، وہ حقوق اور وہ اختیارات مخصوص کر لیے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں ہیں۔ یہ قانون سے بالاتر ہیں۔ ان کے خلاف کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چاہے کچھ کریں، ان کے مقابلہ میں کوئی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی عدالت ان کے نام سمن نہیں بھیج سکتی۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ غلطیاں کرتے ہیں، مگر کہا یہ جاتا ہے اور ماننے والے مان بھی لیتے ہیں کہ بادشاہ غلطی سے پاک ہے۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ معمولی انسان ہیں جیسے اور سب انسان ہوتے ہیں، مگر یہ خدا بن کر سب سے اونچے بیٹھتے ہیں اور لوگ اِن کے سامنے یوں ہاتھ باندھے، سر جھکائے، ڈرے، سہمے کھڑے ہوتے ہیں گویا اُن کا رزق، اُن کی زندگی، اُن کی موت سب اِن کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رعایا کا پیسہ اچھے اور برے ہر طریقے سے گھسیٹتے ہیں اور اسے اپنے محلوں پر، اپنی سواریوں پر، اپنے عیش و آرام اور اپنی تفریحوں پر بے دریغ لٹاتے ہیں۔ اِن کے کتوں کو وہ روٹی ملتی ہے جو کما کر دینے

والی رعایا کو نصیب نہیں ہوتی۔ کیا یہ انصاف ہے؟ کیا یہ طریقہ کسی ایسے عادل کا مقرر کیا ہوا ہو سکتا ہے جسکی نگاہ میں سب انسانوں کے حقوق اور مفاد یکساں ہوں؟

اِن برہمنوں اور پیروں کو دیکھیے، اِن نوابوں اور رئیسوں کو دیکھیے، اِن جاگیرداروں اور زمینداروں کو دیکھیے، اِن ساہوکاروں اور مہاجنوں کو دیکھیے۔ یہ سب طبقے اپنے آپ کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اِن کے زور و اثر سے جتنے قوانین دنیا میں بنے ہیں وہ انہیں ایسے حقوق دیتے ہیں جو عام انسانوں کو نہیں دیے گئے۔ یہ پاک ہیں اور دوسرے ناپاک۔ یہ شریف ہیں اور دوسرے کمین۔ یہ اونچے ہیں اور دوسرے نیچے۔ یہ لوٹنے کے لیے ہیں اور دوسرے لُٹنے کے لیے۔ اِن کے نفس کی خواہشوں پر لوگوں کی جان، مال، عزت، آبرو ہر ایک چیز قربان کر دی جاتی ہے۔ کیا یہ ضابطے کسی منصف کے بنائے ہوئے ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں صریح طور پر خودغرضی اور جانبداری نظر نہیں آتی؟

اِن حاکم قوموں کو دیکھیے جو اپنی طاقت کے بل پر دوسری قوموں کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا کونسا قانون اور کونسا ضابطہ ایسا ہے جس میں خودغرضی شامل نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ کو انسان اعلیٰ کہتی ہیں بلکہ درحقیقت صرف اپنے ہی کو انسان سمجھتے ہیں۔ اِن کے نزدیک کمزور قوموں کے لوگ یا تو انسان ہی نہیں ہیں یا اگر ہیں تو ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ یہ ہر حیثیت سے اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا ہی رکھتے ہیں اور اپنی اغراض پر دوسروں کے مفاد کو قربان کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اِن کے زور و اثر سے جتنے قوانین اور ضوابط دنیا میں بنے ہیں ان سب میں یہ رنگ موجود ہے۔

یہ چند مثالیں میں نے محض اشارے کے طور پر دی ہیں۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جہاں بھی انسان نے قانون بنایا ہے وہاں بے انصافی ضرور ہوئی ہے، کچھ انسانوں کو ان کے جائز حقوق سے بہت زیادہ دیا گیا ہے اور کچھ انسانوں کے حقوق نہ صرف پامال کیے گئے ہیں بلکہ انہیں انسانیت کے درجہ سے گرا دینے میں بھی تامل نہیں کیا گیا

اسکی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے دل و دماغ پر اپنی ذات یا اپنے خاندان، یا اپنی نسل، یا اپنے طبقے یا اپنی قوم ہی کے مفاد کا خیال مسلط ہوتا ہے دوسروں کے حقوق اور مفاد کے لیے اسکے پاس وہ ہمدردی کی نظر نہیں ہوتی جو اپنوں کے لیے ہوتی ہے مجھے بتلایئے، کیا اس بے انصافی کا کوئی علاج اسکے سوا ممکن ہے کہ تمام انسانی قوانین کو دریا برد کر دیا جائے اور اُس خدا کے قانون کو ہم سب تسلیم کر لیں جسکی نگاہ میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں، فرق اگر ہے تو صرف اُس کے اخلاق، اُسکے اعمال اور اُسکے اوصاف Merits کے لحاظ سے ہے نہ کہ نسل یا طبقہ یا قومیت کے لحاظ سے؟

امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے

صاحبو! اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ آدمی کو قابو میں رکھنے والی چیز صرف ذمہ داری کا احساس ہی ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ جو چاہے کرے کوئی اس سے جواب طلب کرنے والا نہیں ہے اور نہ اسکے اوپر کوئی ایسی طاقت ہے جو اسے سزا دے سکے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ شتر بے مہار بن جائیگا۔ یہ بات جس طرح ایک شخص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح ایک خاندان، ایک طبقہ، ایک قوم اور تمام دنیا کے انسانوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ ایک خاندان بھی جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے کوئی جواب طلب نہیں کر سکتا تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ بھی جب ذمہ داری اور جواب دہی سے بے خوف ہو جاتا ہے تو دوسروں پر ظلم ڈھانے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ایک قوم یا ایک سلطنت بھی جب اپنے آپ کو اتنا طاقتور پاتی ہے کہ اس کو اپنی زیادتی کے کسی برے نتیجے کا خوف نہیں ہوتا تو وہ جنگل کے بھیڑیے کی طرح کمزور بکریوں کو پھاڑنا اور کھانا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا میں جتنی بدامنی پائی جاتی ہے اسکی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ جب تک انسان اپنے سے بالاتر کسی اقتدار کو تسلیم نہ کرے، اور جب تک اسے یہ یقین نہ ہو کہ مجھ سے اوپر کوئی ایسا ہے جس کو

مجھے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور جس کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہے کہ مجھے سزا دے سکتا ہے، اس وقت تک یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ظلم کا دروازہ بند ہو اور صحیح امن قائم ہو سکے۔

اب مجھے بتائیے کہ ایسی طاقت سوائے خداوند عالم کے اور کونسی ہو سکتی ہے؟ خود انسانوں میں سے تو کوئی ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ جس انسان یا جس انسانی گروہ کو بھی آپ یہ حیثیت دینگے خود اس کے شتر بے مہار ہو جانے کا امکان ہے، خود اس سے اندیشہ ہے کہ تمام فرعونوں کا ایک فرعون وہ ہو جائیگا اور خود اس سے یہ خطرہ ہے کہ خود غرضی اور جانبداری سے کام لیکر وہ بعض انسانوں کو گرائیگا اور بعض کو اٹھائیگا۔ یورپ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مجلس اقوام بنائی تھی۔ مگر بہت جلدی وہ سفید رنگ والی قوموں کی مجلس بن کر رہ گئی اور اس نے چند طاقتور سلطنتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر کمزور قوموں کے ساتھ بے انصافی شروع کر دی۔ اس تجربہ کے بعد اس امر میں شک باقی نہیں رہ سکتا کہ خود انسانوں کے اندر سے کوئی ایسی طاقت برآمد ہونی ناممکن ہے جس کی باز پرس کا خوف فرداً فرداً ایک ایک شخص سے لیکر دنیا کی قوموں اور سلطنتوں تک کو قابو میں رکھ سکتا ہو۔ ایسی طاقت لامحالہ انسانی دائرے سے باہر اور اس سے اوپر ہی ہونی چاہیے، اور وہ صرف خداوند عالم ہی کی طاقت ہو سکتی ہے۔ ہم اگر اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ خدا پر ایمان لائیں، اسکی حکومت کے آگے اپنے آپ کو فرمانبردار رعیت کی طرح سپرد کر دیں، اور اس یقین کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کریں کہ وہ بادشاہ ہمارے کھلے اور چھپے سب کاموں کو جانتا ہے اور ایک دن ہمیں اس کی عدالت میں اپنی پوری زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہے۔ ہمارے شریف اور پر امن انسان بننے کی بس یہی ایک صورت ہے۔

ایک شبہ

اب میں اپنے خطبہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک شبہ کو صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو غالباً

آپ میں سے ہر ایک کے دل میں پیدا ہو رہا ہوگا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ جب خدا کی حکومت اتنی زبردست ہے کہ خاک کے ایک ذرہ سے لیکر چاند اور سورج تک ہر چیز اسکے قابو میں ہے، اور جب انسان اس کی حکومت میں محض ایک رعیت کی حیثیت رکھتا ہے تو آخر یہ ممکن کس طرح ہوا کہ انسان اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرے اور خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے اسکی رعیت پر اپنا قانون چلائے؟ کیوں نہیں خدا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور کیوں اسے سزا نہیں دیتا؟ اس سوال کا جواب میں چند مختصر الفاظ میں دونگا۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی حکومت میں انسان کی حیثیت قریب قریب ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی ضلع کا افسر بنا کر بھیجتا ہے۔ ملک بادشاہ ہی کا ہوتا ہے۔ رعیت بھی اسی کی ہوتی ہے۔ ریل، ٹیلیفون، تار، فوج اور دوسری تمام طاقتیں بادشاہ ہی کے ہاتھ میں رہتی ہیں، اور بادشاہ کی سلطنت اس ضلع پر چاروں طرف سے اس طرح چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اس چھوٹے سے ضلع کا افسر اس کے مقابلہ میں بالکل عاجز ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ چاہے تو اس کو پوری طرح مجبور کر سکتا ہے کہ اسکے حکم سے بال برابر منہ نہ موڑ سکے۔ لیکن بادشاہ اس افسر کی عقل کا، اس کے ظرف کا اور اس کی لیاقت کا امتحان لینا چاہتا ہے، اسلیے وہ اس پر سے اپنی گرفت اتنی ڈھیلی کر دیتا ہے کہ اسے اپنے اوپر کوئی بالاتر اقتدار محسوس نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ افسر عقلمند، نمک حلال، فرض شناس اور وفادار ہے تو اس ڈھیلی گرفت کے باوجود وہ اپنے آپ کو رعیت اور ملازم ہی سمجھتا رہتا ہے، بادشاہ کے ملک میں اسی کے قانون کے مطابق حکومت کرتا ہے، اور جو اختیارات بادشاہ نے اسے دیے ہیں انہیں خود بادشاہ کی مرضی کے موافق استعمال کرتا ہے۔ اس وفادارانہ طرز عمل سے اسکی اہلیت ثابت ہو جاتی ہے اور بادشاہ اسے زیادہ بلند مرتبوں کے قابل پاکر ترقیوں پر ترقیاں دیتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ افسر بے وقوف، نمک حرام اور شریر ہو اور رعیت کے وہ لوگ جو اس ضلع میں رہتے ہیں، جاہل اور نادان ہوں، تو اپنے اوپر سلطنت کی گرفت ڈھیلی پاکر وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، اسکے

دماغ میں خود مختاری کی ہوا بھر جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو ضلع کا مالک سمجھ کر خود سرانہ حکومت کرنے لگتا ہے اور جاہل رعیت کے لوگ محض یہ دیکھ کر اسکی خود مختارانہ حکومت تسلیم کر لیتے ہیں کہ تنخواہ یہ دیتا ہے، پولیس اسکے پاس ہے، عدالتیں اسکے ہاتھ میں ہیں، جیل کی ہتھکڑیاں اور پھانسی کے تختے اسکے قبضہ میں ہیں، اور ہماری قسمت کو بنانے یا بگاڑنے کے اختیارات یہ رکھتا ہے۔ بادشاہ اس اندھی رعیت اور اس باغی افسر دونوں کے طرز عمل کو دیکھتا رہتا ہے چاہے تو فوراً پکڑ لے اور ایسی سزا دے کہ ہوش ٹھکانے نہ رہیں۔ مگر وہ ان دونوں کی پوری آزمائش کرنا چاہتا ہے، اسلیے وہ نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ انہیں ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے تاکہ جتنی نالائقیاں ان کے اندر بھری ہوئی ہیں، پوری طرح ظاہر ہو جائیں۔ اسکی طاقت اتنی زبردست ہے کہ اسے اس بات کا کوئی خوف ہی نہیں ہے کہ یہ افسر کبھی دور پکڑ کر اس کا تخت چھین لیگا۔ اسے اس بات کا بھی کوئی اندیشہ نہیں کہ یہ باغی اور نمک حرام لوگ اسکی گرفت سے نکل کر کہیں بھاگ جائینگے اسلیے اسے جلد بازی کے ساتھ فیصلہ کر دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سالہا سال بلکہ صدیوں تک ڈھیل دیتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب لوگ اپنی پوری خباثت کا اظہار کر چکتے ہیں اور کوئی کسر اسکے اظہار میں باقی نہیں رہتی تب وہ ایک روز اپنا عذاب ان پر بھیجتا ہے اور وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ کوئی تدبیر اس وقت انہیں اس کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

صاحبو! میں اور آپ اور خدا کے بنائے ہوئے یہ افسر، سب کے سب اِسی آزمائش میں مبتلا ہیں۔ ہماری عقل کا، ہمارے ظرف کا، ہماری فرض شناسی کا، ہماری وفاداری کا سخت امتحان ہو رہا ہے۔ اب ہم میں سے ہر شخص کو خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اصلی بادشاہ کا نمک حلال افسر یا رعیت بننا پسند کرتا ہے یا نمک حرام۔ میں نے اپنی جگہ نمک حلالی کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں ہر اُس شخص سے باغی ہوں جو خدا سے باغی ہے۔ آپ اپنے فیصلے میں مختار ہیں، چاہے یہ راستہ اختیار کریں یا وہ۔ ایک طرف وہ نقصانات اور وہ فائدے ہیں جو خدا کے یہ باغی ملازم پہنچا سکتے ہیں، اور دوسری طرف وہ نقصانات اور وہ فائدے ہیں جو خود خدا پہنچا سکتا ہے۔ دونوں میں سے جسکو آپ انتخاب کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

مطبوعات

اتاترک | تالیف جناب محمد مرزا صاحب دہلوی۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ مجلد بجلد نفیس۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانۂ علم و ادب، دہلی۔

مصنف نے از راہ انکسار اس کتاب کو اتاترک کی سوانح عمری قرار دیا ہے لیکن اگر وہ اسے "قصیدۂ نعتیہ در شان اتاترک علیہ السلام" کے نام سے موسوم کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ترکی میں ایک نبی مبعوث ہوا تھا جو تمام ممکن التصور کمالات کا مجموعہ، جملہ عیوب و نقائص سے منزہ، اور بڑی حد تک فوق البشری قوتوں سے مسلح تھا۔ زندگی بھر اس نے جو کچھ کیا خوب ہی کیا، قسم کھانے کو بھی کہیں اس سے غلطی سرزد نہ ہوئی، جہاں جس کسی انسان سے بھی اس کا اختلاف ہوا وہاں وہی حق پر تھا اور اس سے اختلاف کرنیوالا ہی برسر غلط بلکہ اخلاقی گنہگار تھا، اس کے جن جن افعال پر دنیا میں کہیں کسی وقت نکتہ چینی کی گئی ہے ان سب میں وہ خطا و لغزش سے پاک نظر آتا ہے اور خطا اگر پائی جاتی ہے تو خود نکتہ چینیوں میں کہ حضرت اتاترک ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ مصنف کے الفاظ میں "اتاترک کی شخصیت قدیم اور جدید تاریخ میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور ڈھونڈے سے بھی کوئی انکا مثیل نظر نہیں آتا"۔ صلوا علیہ و آلہ۔

یہ تمام مبالغہ جس شخص کے حق میں کیا گیا ہے اسے مرے ہوئے ابھی کچھ بہت زیادہ دن بھی نہیں گذرے ہیں کہ ماضی کے دھندلکے سے فائدہ اٹھاکر اسے دیوتا بنا ڈالا جائے۔ پرانے زمانے کے پتھر کو آج ہاتھی بنایا جاسکتا ہے مگر ہم عصروں کی آنکھوں میں آپ کہاں تک خاک جھونکینگے۔ بلاشبہ اتاترک ایک اچھا جنرل تھا۔ قیادت کی بعض صلاحیتیں بھی اس میں پائی جاتی تھیں۔ سیاسی تدبر بھی ایک حد تک اس میں موجود تھا۔ اسکی رہنمائی میں ایک شکست خوردہ قوم تباہی سے بچ گئی اور اس نے اپنے قومی وطن کو پھر سے ایک آزاد سلطنت بنالیا۔ اس کارنامے پر اس کی جتنی چاہیے تعریف کرلیجیے۔ لیکن تہذیبی و تمدنی مسائل میں اس کے علم و بصیرت کا معیار ہمارے کالجوں سے نکلے ہوئے عام "صاحب بہادروں" سے کچھ بھی زیادہ اونچا نہ تھا۔ اپنے ملک کو آزاد کرانے کے بعد جب احسان مند ترکی قوم کو اس نے اپنا گرویدہ پایا تو اسے اپنے متعلق یہ غلط فہمی

ہوگئی کہ میں حکیم بھی ہوں اور ایک نئی قوم کی تعمیر بھی صحیح طور پر کرسکتا ہوں ۔ اس غلط فہمی کی بنا پر اس نے ترکی قوم کی تعمیر جدید کا
کام تنہا اپنے ہاتھ میں لیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس عالم میں کم از کم اس سے زیادہ علم و بصیرت رکھتے تھے ، میدان سے ہٹا دیا ۔ اس طرح
مختار مطلق بننے کے بعد اس نے جو کچھ کیا مغربی تہذیب کا ہر مشرقی نقال اسکے سے اختیارات پا کر وہی کرتا ۔ کسی مجتہدانہ فکر ، کسی
قوت انتخاب ، کسی صلاحیت تنقید اور کسی آزادانہ اختراعی قابلیت کا اسکے پورے کارنامے میں ادنیٰ شائبہ تک نہیں
ملتا ۔ خیالات ، اصول ، طریقے ، سب ہی چیزیں تو وہ مفلس دماغ کا انسان یورپ سے مانگ لایا اور اپنے ذاتی اجتہاد سے
ذرہ برابر کام لیے بغیر جوں کا توں اپنی قوم کے سر منڈھتا چلا گیا ۔ اس بیچارے میں اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ یورپ کے اسباب عروج
اور اسباب تنزل میں فرق کرتا ۔ عام سطحی النظر لوگوں کی طرح اس نے بھی یہی سمجھا کہ برسر عروج قوموں کی ہر چیز اچھی ہے چنانچہ
وہ مفید چیزوں کے ساتھ ایسی بیماریاں بھی ٹرکی میں لے آیا جنکی وجہ سے خود یورپ کی زندگی آج تباہ ہو رہی ہے ۔ یہ کونسا
ایسا بڑا کارنامہ ہے جسکی بنا پر اس شخص کو آسمان پر چڑھایا جاتا ہے ؟ دنیا کے تہذیبی معماروں کی صف اول میں تو درکنار
وہ غریب تو انکی صف آخر میں بھی جگہ پانے کے قابل نہیں ۔ ایک کاپی نویس کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیے تعریف کرلیجیے کہ
بہت صحیح نقل کرتا ہے اور نقل و اصل میں ذرا فرق باقی نہیں رہنے دیتا ۔ مگر کیا انشا پردازوں کی مجلس میں اسکو جلیس
پر بھی کھڑے ہونے کی جگہ مل سکتی ہے ؟ ہم یورپ کے ان ناخدا شناس مفکرین کی قدر کرسکتے ہیں جنہوں نے اپنے زور طبع سے
کسی نئے نظام فکر و مذہب عمل کی بنا رکھی ۔ مگر اتاترک اور رضا شاہ پہلوی جیسے تھرڈ کلاس آدمیوں کی ہم کیا قدر کریں
جنکی پوری زندگی سے ایک اجتہادی کارنامہ بھی نکال کر نہیں بتایا جاسکتا ۔

اتاترک کی مبالغہ آمیز تعریف سے تو مصنف نے صرف اتنا ہی ظاہر کیا تھا کہ ان کا معیار کمال انسانی کتنا بلند ہے ،
مگر جہاں انہوں نے اپنے ممدوح کو مسلمان اور وہ بھی پکّا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہاں یہ راز بھی فاش ہوگیا
کہ ماشاء اللہ انکو اضداد کے جمع کرنے میں بھی پورا کمال حاصل ہے ۔ دیباچہ میں جب ہم نے انکے یہ الفاظ پڑھے کہ
"اتاترک کے الحاد و بے دینی کے افسانے" یورپ کی خبر رساں ایجنسیوں کے پھیلائے ہوئے ہیں اور ہندوستان کے "قدامت
پرستوں" کا گروہ محض مغربی پروپیگنڈا کا شکار ہوگیا ہے تو ہمیں توقع ہوئی کہ آگے چل کر شاید کچھ اتاترک کے مسلمان ہونے

کی ایسی شہادتیں پیش کی جائینگی جو اس پروپیگنڈا کی پوری طرح تردید کرکے اُس کی دینداری ثابت کر دینگی۔ مگر جب اس بحث کا موقع آیا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فاضل مصنف نے اپنی تمام چیزوں سے اتاترک کے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہے جو دراصل اس شخص کے نامسلمان ہونے کا ثبوت ہیں۔ وہ خود تسلیم فرماتے ہیں کہ اتاترک نے اسلامی قانون ترکی قلمرو سے یک قلم منسوخ کرکے جرمنی کا تجارتی قانون، اٹلی کا فوجداری قانون اور سوئٹزرلینڈ کا دیوانی قانون جاری کیا۔ وراثت میں عورتوں اور مردوں کو مساوی قرار دیا۔ تعدد ازدواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا۔ مصوری، بت تراشی اور موسیقی کے معاملہ میں وہ "مذہبی یا اخلاقی نقطۂ نظر کے قائل نہ تھے" اور "ترکوں کے دماغوں سے اس مذہبی خیال کو محو کرنے کے لیے" انہوں نے خود اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بت بنوا کر انقرہ، سمرنا اور قسطنطنیہ میں شاہراہوں پر نصب کرائے، مصوری کے اسکول اور کالج قائم کیے، اور مہذب اقوام کے مختلف طرز کے رقص رائج کیے۔ "ترقی نسواں" کے سلسلہ میں انہوں نے پردہ کا کلّی استیصال کیا اور ترکی عورتوں کو آزادی کے ٹھیک اس مقام پر لاکر کھڑا کر دیا جس پر انکی مغربی بہنیں اس وقت کھڑی ہیں۔ ان سب واقعات کو بیان فرمانے کے بعد جناب مصنف پھر اپنی اس شکایت کو دہراتے ہیں کہ "ان انقلابی اصلاحات کے نفاذ سے یورپ کی بعض حریف قوتوں کو ترکی جمہوریہ اور غازی پاشا کی ذات کے خلاف بے دینی اور لامذہبی کے پروپیگنڈے کا موقع ہاتھ آ گیا" اور یہ کہ "اس غلط پروپیگنڈا سے اسلامی ممالک میں غازی پاشا اور انکی حکومت کے خلاف عام طور پر بدظنی سی پیدا ہو گئی"۔ سبحان اللہ! قرآن کے صریح احکام سے بغاوت، اسلامی قانون کی مکمل تنسیخ اور اسلام کے اصولِ تہذیب و تمدن سے کلی انحراف کے بعد بھی بے دینی و لامذہبی کا قصہ صرف "غلط پروپیگنڈا" ہی رہا اور ان حرکات سے مسلمانوں نے جو کچھ نتیجہ نکالا اسکی حقیقت "بدظنی" سے زیادہ کچھ نہ نکلی!!

فاضل مصنف جس امت سے تعلق رکھتے ہیں اسکی زبان میں "ہر تغیر" کا نام "اصلاح" ہے۔ قرآن نے جو قانون پیش کیا ہے اس کو بدل ڈالنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی تہذیب کے اصولوں کو منسوخ کر دینا بھی ان لوگوں کے نزدیک "اصلاح" ہی کی تعریف میں آتا ہے۔ انکو ایسی رائے رکھنے کا پورا حق ہے اور ہم اس حق کو ان سے

سلب نہیں کرسکتے۔ مگر ہمیں اعتراض جس چیز پر ہے وہ صرف یہ ہے کہ آخر یہ لوگ متضاد باتیں کیوں کرتے ہیں۔ مسولینی نے اشتراکیت کو رد کردیا اور اس کی جگہ فاشزم اختیار کرلیا۔ ہر صاحب عقل آدمی اس واقعہ کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرے گا اور کہدے گا کہ مسولینی اشتراکی نہیں رہا بلکہ فاشسٹ ہوگیا۔ ایک مسلک سے ارتداد کے بعد بھی کسی شخص کو کھینچ تان کر اسی مسلک کا پیرو ثابت کرنا ظاہر ہے کہ کسی صحیح الدماغ آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ ہمارے ہاں "غیر مسلم مسلمانوں" کا ایک عجیب الخلقت گروہ پیدا ہو رہا ہے جو اسلام کے نظام فکر اور اس کے اساسی قانون سے بغاوت کرکے ایک دوسرے نظام فکر و قانون حیات کو علانیہ قبول کرلیتا ہے اور پھر اصرار کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم اس رد و قبول کے بعد بھی ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے اس حادثہ سے پہلے تھے۔ کیا یہ تناقض بیان کسی ذہنی الجھاؤ کی وجہ سے ہے، یا ان لوگوں میں ابھی اتنی قدامت پرستی باقی ہے کہ ایک پرانا فرسودہ نام جو باپ دادا کے وقتوں سے چلا آرہا ہے اس کو کسی حال میں یہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے؟

یہ تبصرہ کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہوگیا ہے مگر مصنف کے چند "شاہکار" فقروں کی زیارت سے ناظرین کو محروم رکھنا ظلم سے کم نہ ہوگا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> "وہ ترکی آداب و معاشرت اور رسم و رواج تک میں مانگے تانگے کا کوئی حقیر جز بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ترکی زبان تک کو بھی، جس میں صدیوں سے ایرانی اور عربی زبانوں کے بیشتر الفاظ گھل مل چکے تھے اور الفاظ بھی ایسے جنکے بدل ترکی زبان میں نہ مل سکتے تھے، غازی پاشا نے غیر ملکی الفاظ سے پاک کردیا۔"

خط کشیدہ فقرہ کی تشریح میں اگر لگے ہاتھوں یہ بھی ثابت کردیا جاتا کہ ہیٹ اور لاطینی رسم الخط دراصل ترکوں سے یورپ والے مانگ لے گئے ہیں، تجارتی، فوجداری اور دیوانی قوانین دراصل ٹرکی میں بنے تھے جنہیں اٹلی، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے لوگ لے اڑے، اور انقرہ کی عمارات جس طرز

تعبیر پر مبنی ہیں وہ ترک اپنے ساتھ وسط ایشیا سے لائے تھے، تو یہ ایسا تاریخی انکشاف ہوتا جس پر ساری دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

"ترک ایک نئی قوم بن گئے۔ نئے نئے حوصلے اور نئے نئے ارادے ان میں پیدا ہوگئے۔ مغربی تمدن کا طلسم ٹوٹ چکا۔ اور اسی کے ساتھ یورپ سے ان کی وہ مرعوبیت بھی رخصت ہوئی جو صدیوں سے ان کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھی۔"

دنیا میں آج تک جتنے طلسم ٹوٹے ہیں ان میں اس طلسم کا ٹوٹنا بس آپ ہی اپنی نظیر ہے ظالم کچھ اس طرح ٹوٹا کہ پورے ملک میں اب وہی وہ نظر آتا ہے۔ اس نرالی قسم کی شکست نے تو لغت میں "طلسم ٹوٹنے" کا مفہوم ہی بدل ڈالا۔ اور یہ مرعوبیت کے رخصت ہونے کا معاملہ بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ بکری میں اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ بکری رہتے ہوئے بھیڑیے سے نہ ڈرتی۔ اب اس نے بھیڑیے کی کھال اوڑھ لی ہے اور اپنی چال، ڈھال، آواز، ہر چیز میں بھیڑیوں کی نقل اتار رہی ہے تاکہ بھیڑیے اسے اپنا ہم جنس سمجھ کر چھوڑ دیں۔ ہم تو خدا سے چاہتے ہیں کہ بیچاری اسی چال کی بدولت جیتی رہ جائے، مگر مشکل یہ ہے کہ سابقہ ان گرگان باراں دیدہ سے ہے جو اپنی جنس کے بہت سے بھیڑیوں کو پھاڑ چکے ہیں۔ کاش اس جاہل اتاترک نے قرآن اور سیرت محمدی کا مطالعہ کیا ہوتا اور ترکی قوم پرستی کے بجائے اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ترکی جدید کی تعمیر کی ہوتی! اس کو اگر معلوم ہوتا کہ ایک محدود قومیت کی طاقت اور ایک عالمگیر تبلیغی مسلک کی طاقت میں کتنا عظیم تفاوت ہوتا ہے، تو وہ اپنی قوم کو پولینڈ، ہالینڈ اور بلجیم کی سی پوزیشن میں چھوڑ کر نہ جاتا بلکہ روسی اشتراکیت سے بیس گنی زیادہ زبردست طاقت کے ساتھ چھوڑ جاتا۔

مصنف کا سب سے زیادہ دلچسپ فقرہ یہ ہے اور بس اسی پر خاتمۂ کلام ہے:

"انہوں نے مذہب کی اصلی روح کو برقرار رکھتے ہوئے درویشوں اور مولویوں کی خود ساختہ اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث توہمات نے جو اعتقادات کی صورت اختیار کر لی تھی انہیں دور کر دیا۔

.... مذہب اسلام کے متعلق اتاترک کا نظریہ یہ تھا کہ مذہب تمدنی ترقیوں کی راہ میں حائل نہیں بلکہ دنیا کے سارے مذاہب میں صرف مذہب اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں دنیاوی ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس میں اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ درویشوں اور مولویوں کے وجود سے پیدا ہو گئی ہے .... اسی خیال کے ماتحت ترکی سرزمین کو اتاترک نے ملاؤں اور درویشوں کے وجود سے پاک کیا اور ترکوں کو مذہب اسلام کی اصلی روح سے مانوس ہونے کا موقع دیا۔ اور فی الحقیقت اتاترک کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مذہبی اصلاح کی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی"۔

شاندار مگر بے معنی الفاظ کا کتنا عجیب مجموعہ ہے! ان لوگوں کے لچک دار اسلام کی کیا تعریف کی جائے! اس کمبخت میں اس غضب کی لچک موجود ہے کہ "دنیاوی ترقیوں" کی خاطر قرآن کا قانون منسوخ کر دینے تک کی گنجائش اس میں نکل آتی ہے۔ اور اس "مذہب اسلام کی اصلی روح" کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ ملا اور درویش کو سامنے رکھ کر اس طرح ڈائنا مائیٹ سے اڑا دیئے کہ قرآن و سنت بھی ساتھ ساتھ اڑ جائیں۔ اسکے بعد جو کچھ بچ رہے اس کا نام "خالص روح اسلام" ہے!

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں ۵ نسخے — علاوہ محصول ڈاک

نو روپے میں ۵۰ نسخے
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے — کرایہ ریل بذمہ خریدار

حصہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصُول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

۲ روپے ۴ آنہ میں . . . . . ۵ نسخے
محصول ڈاک بذمہ خریدار

۱۱ روپے ۸ آنہ میں ۲۵ نسخے
۲۲ روپے میں ۵۰ نسخے
۴۰ روپے میں ۱۰۰ نسخے — کرایہ ریل بذمہ خریدار

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموما لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلا توحید' ہدایت و ضلالت' عبادت' جہاد' آزادی' رواداری' قومیت اسلامی' عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا' رسول کی صحیح حیثیت' رسالت محمدی کا ثبوت عقلی' شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق' منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شُدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مُسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مُسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔